اُردو نثری ادب

سید ابوالخیر کشفی
ظہیرالدین احمد

اردو مرکز لاہور

اُردو نثری ادب

اُردو

نثری ادب

مرتّبہ

ابوالخیر کشفی

ظہیرُالدّین احمد

اُردو مرکز گنپت روڈ۔ لاہور

پہلی بار

مطبوعہ : مشہو

کراچی آفس :

اردو اکیڈمی سندھ

مشن روڈ کراچی

مندرجات

ادبی خطوط

خطوط اور انکی اہمیّت از ڈاکٹر عبدالحق

خطوں کے آئینے میں

اُردو نثری ادب کا مختصر جائزہ

اُردو نثر کا آغاز

دنیا کی ہر زبان کی طرح اُردو زبان میں بھی ادبی طور پر نظم پہلے عالمِ وجود میں آئی اور نثر اُس کے بعد۔ اُردو میں شاعری شروع ہو گئی تھی لیکن تہذیبی اور سرکاری زبان فارسی ہی تھی۔ اور تو اور لوگ خط بھی فارسی میں لکھتے تھے۔

اُردو نثر کے اوّلین نمونے بھی نظم کی طرح ہمیں دکنی ادب میں ملتے ہیں۔ دکن میں نثر اُردو کی ابتدا آٹھویں صدی ہجری میں ہو گئی تھی۔ مولوی عبدالحق اور حکیم سید شمس الدین قادری کی تحقیقی کاوشوں نے ان نمونوں سے ہمیں آشنا کیا۔ شیخ عین الدین گنج العلم، حضرت خواجہ گیسو دراز، سید محمد عبداللہ الحسینی، شاہ میراں جی، شمس العشاق اور مُلا وجہی اُردو کے اوّلین نثر نگاروں میں ہیں۔ ان سب کا موضوع ایک ہی ہے یعنی تصوّف اور مذہب — شمالی ہند میں نثر کی ابتدا فضلی کی "دہ مجلس" سے ہوتی ہے جس کا سنِ تصنیف ۱۷۳۲ء ہے۔ اس عہد کی دوسری کتاب تحسین کی "نو طرزِ مرصع" ہے، یہ فارسی قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے اور سنِ تصنیف ۱۷۹۰ء ہے۔

فورٹ ولیم کالج

۱۸۰۰ء کا سن اُردو نثر کے لئے سنگِ میل ہے۔ سیاسی حالات بدل چکے تھے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ اُس دور کا تمدنی نشان یعنی فارسی زبان مائل بہ تنزل تھا۔ اُردو ایک عوامی زبان کی حیثیت سے زندگی میں اپنے لئے موقر جگہ حاصل کر رہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ حل و عقد نے یہ حقیقت سمجھ لی۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ جس کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرائسٹ تھے۔ ہندوستان کے ادبی مرکزوں

میں انتشار اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ صاحبانِ کمال ٹھکانوں کے لئے بھٹک رہے تھے۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اچھے اچھے ادیبوں کو فورٹ ولیم کالج میں جمع کر لیا۔ میر امن، شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، میرزا علی لطف، حیدر بخش حیدری، میر کاظم علی جوان اور للو لال جی اُن ادیبوں میں زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں ——— فورٹ ولیم کالج کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو اُردو کی تعلیم دینا تھا لیکن اس تدریسی مقصد کے لئے اُردو میں کتابیں ہی نہ تھیں۔ یہ کام اِن ادیبوں نے کیا۔ اُردو قواعد پر پہلی کتابیں یہیں لکھی گئیں، داستانوں کے ترجمے سلیس اور آسان زبان میں لکھے گئے۔ اِن داستانوں میں میر امن کے باغ و بہار کی حیثیت "کوہِ نور" کی سی ہے۔ اس کتاب نے اُردو نثر کے اسالیب کی شیرازہ بندی کی۔ مروجہ پُر تصنع طرزِ تحریر سے بغاوت کر کے میر امن نے ایسا اسلوب اختراع کیا جو آنے والے ادبی اسالیب کا پیش رو تھا۔

فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی نثر میں کچھ کام ہو رہا تھا۔ فقیر محمد گویا اور رجب علی بیگ سرور اُردو نثر کی خدمت کر رہے تھے۔ رجب علی بیگ سرور نے سلاست کی جگہ مروجہ پُر تصنع اسلوب کو قبول کیا اور اُن کا فسانۂ عجائب اُسی انداز کا مکمل نمونہ ہے۔ اس میں مقفّٰی اور مسجع نثر کی تمام خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ اسی زمانہ میں مذہبی ادبیات میں بھی اضافہ ہوا۔ دلّی کے بزرگانِ دین نے اُردو میں قرآن مجید کے ترجمے کئے۔ سید انشاء اللہ خاں انشاء اور قتیل نے لسانیات کے موضوع پر پہلی کتاب دریائے لطافت ۱۸۰۷ء میں لکھی۔ دریائے لطافت میں اُردو زبان کی ساخت پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اُن کی اہمیت آج بھی مُسلّم ہے۔

مرزا غالب میر امن کے بعد اُردو نثر کو مرزا غالب جیسا فن کار ملا جس

نے سادگی کو پُر کاری بنا دیا۔ غالبؔ نے نثر میں کوئی باقاعدہ تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی لیکن اُن کے خطوط نے اُردو نثر کی دنیا ہی بدل دی۔ شاید ہی دنیا کے کسی ادب میں کسی ادیب کے خطوط نے اُس ادب کے مزاج اور اسالیب کو اس قدر متاثر کیا ہو۔ غالبؔ کے خطوط میں ظرافت کا ایک نیا انداز ہے اور بقولِ غالبؔ یہ خط لکھنا نہیں باتیں کرنا ہے۔ یہ خط تاریخی اور دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرزا غالبؔ کی زندگی، اُن کے شب و روز اور دہلی کے تمدنی حالات کی ایسی سچی اور واضح تصویر کہیں اور نہیں ملتی۔ خطوطِ غالبؔ کی وہی کیفیت ہے جو حُسنِ محبوب کی

ع ہزار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اِن خطوں میں ڈرامائی کیفیت ہے، مزاح کے کتنے ہی پہلو ہیں، زندگی کے مشاہدے اور تجربے ہیں اور وہ اسلوبِ تحریر ہے جس کی نقل کسی سے نہ ہو سکی، اضافہ تو بڑی بات ہے۔

اِس عہد کے دوسرے ممتاز نثر نگار ماسٹر رام چندر، اور غلام غوث بے خبر ہیں جن کے خطوط ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس زمانہ میں چھاپہ خانہ کے رواج نے بھی اُردو نثر کے ارتقا کو تیز تر کر دیا۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ٹائپ کو فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کے لئے پسند کیا تھا۔ کانپور، دہلی اور لکھنؤ میں لیتھو پریس قائم ہوئے اور کتابیں زیادہ تعداد میں چھپنے لگیں۔

علی گڑھ تحریک

فورٹ ولیم کالج کے بعد علی گڑھ تحریک اُردو نثر کے ارتقا کی ایسی کڑی ہے جس نے اُردو کو ایک علمی و ادبی درجہ دے دیا۔ اب تک سادگی و سلاست داستان اور مکتوب نویسی

تک محدود تھی۔ اردو میں مقالہ نگاری اور علمی مباحث پر تحریروں کی کوئی روایت نہ تھی۔ سرسید نے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے زبان اور قلم دونوں سے مدد لی اور یہیں سے اُردو نثر کے عہدِ نو کا آغاز ہوتا ہے — تہذیب الاخلاق ایک نئے دَور کی پہلی کرن تھا۔ سرسید اور اُن کے رفقا نے معاشرتی، سماجی، تعلیمی، تمدنی اور مذہبی مسائل پر بہت کچھ لکھا۔ سرسیّد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا اسلوب موضوع کے ساتھ اس طرح بدل جاتا ہے کہ شاید اُنہیں بھی خبر نہ ہوتی ہو۔ بحث و تکرار میں مزاح کی شگفتگی ہے، اُمید کی خوشی میں شاعرانہ رنگ و آہنگ ہے اور دُوسرے مضامین میں علم کا وقار ہے۔ سرسید کو اپنا مقصد ادبی آرائش و حُسن سے زیادہ عزیز تھا، وہ زبان و بیان پر زیادہ توجہ نہ کرتے تھے لیکن اس بے پروائی میں مخصوص حُسن ہے۔

سرسید کو جو ادبی رفقا ملے، انہوں نے اس دور کو بقول مہدی الافادی ادبی نشاۃ الثانیہ کا عہد بنا دیا —— اُردو نثر نے نئے موضوعات پر فاتحانہ یلغار کی اور اپنے دامن کو دامنِ جواہر بنا لیا۔ محسن الملک اور چراغ علی عملی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ادبی مہم میں بھی سرسید کے شریک رہے — حالی نے اپنے آپ کو سرسید سے ذہنی طور پر پوری طرح وابستہ کر لیا تھا۔ شبلی اگرچہ علی گڑھ سے علیحدہ ہو گئے تھے لیکن تصنیف و تالیف کا ذوق اُن میں سرسید ہی نے پیدا کیا تھا۔ نذیر احمد بھی سرسید کی اصلاحی تحریکوں سے دلچسپی لیتے تھے اور یہ اصلاحی روح اُن کی تحریروں میں ملتی ہے سرسید اس دَور کے ادبی سیمسن (SAMSON) تھے لیکن وہ

محمد حسین آزاد کو نہ جیت سکے۔ آزاد عالمِ خیال کے بندے تھے لیکن آنے والے ادبی دور کی پیشوائی و پذیرائی انہوں نے بھی اپنے قلم سے کی۔

آزاد نے تمثیلی مضمون نگاری کو نیرنگِ خیال میں ایک مستقل صنفِ ادب بنادیا۔ وقار عظیم نے نیرنگِ خیال کو اردو افسانہ کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے۔ آبِ حیات پہلی ادبی تاریخ ہے، اور آزاد نے سب سے پہلے اُردو زبان کی تاریخ پیش کی ہے۔ اُن کے نظریہ کی صحت آج مشکوک ہے لیکن اُن کی اولیات سے کس کو انکار ہوگا۔ آزاد کے رنگ و آہنگ کا انشاء پرداز پھر نہیں پیدا ہوا۔

اُردو تنقید

حالی سے نئی تنقید اور سوانح نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔ حالی کی سوانح نگاری میں نفسیاتی غیر جانبداری اور ادبی معیار ملتا ہے۔ حیاتِ جاوید صرف سر سیّد کی سوانح عمری نہیں بلکہ اِس آئینہ خانہ میں ہمارے ملک کی پچاس سالہ تعلیمی، ادبی، سماجی اور ذہنی تاریخ کا ہر نقش منعکس ہوگیا ہے۔ آج ہماری تنقید میں ادب کی ماہیت اور نوعیت، زندگی اور ادب کے تعلق اور ادب کی سماجی حیثیت کے متعلق جو اصولی بحثیں ہوتی ہیں ان کی ابتدا حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری" سے ہوتی ہے۔ مقدمہ نے ادب کے متعلق ہمارے نقطۂ نظر کو یکسر بدل دیا، انہوں نے بتایا کہ ادب ذہنی عیّاشی اور شوق کی چیز نہیں بلکہ قومی، ذہنی اور تہذیبی زندگی کی آرائش کا ذریعہ اور وسیلہ ہے ــــــ وحید الدین سلیم، مہدی الافادی اور مولوی عبد الحق نے حالی کے تنقیدی انداز کو آگے بڑھایا۔ مہدی الافادی کے یہاں حالی کی تقلید ہی نہیں بلکہ ان کی تنقید عبد الرحمن بجنوری کی

طرح اپنی جداگانہ خصوصیات رکھتی ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے حالی کے تنقیدی نظریات کو زیادہ مستحکم اور واضح کر دیا۔

عہد حاضر میں اردو میں تنقید کا جو سرمایہ نظر آتا ہے اس کا سلسلہ مقدمۂ شعر و شاعری سے شروع ہوا۔ ادب کی سماجی حیثیت کو حالی کی پیروی کرتے ہوئے نئے نقادوں نے ہمیشہ اپنے سامنے رکھا مجنوں گورکھپوری اختر حسین رائے پوری، آل احمد سرور اور احتشام حسین نے عمرانی علوم کی مدد سے اسی نظریہ کو آگے بڑھایا۔ یہ نقاد مغربی تنقید و علوم سے زیادہ آگاہی رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں یہ مسائل ہمارے دور کی روح سے ہم آہنگ ہیں۔ مسعود حسن ادیب، نیاز فتحپوری، حامد حسن قادری اور عندلیب شادانی حالی کے مقلد تو نہیں لیکن حالی سے انہوں نے بھی فیض اٹھایا ہے۔ آج کی اردو تنقید میں ہمیں کئی دبستانِ فکر بیک وقت نظر آتے ہیں۔ نیاز اور فراق کے یہاں تاثراتی رنگ واضح ہے۔ کلیم الدین احمد اور محمد حسن عسکری کا نقطۂ نظر بڑی حد تک مغربی ہے اور انہوں نے نئی ادبی قدریں قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بزرگوں میں مولوی عبد الحق، محمود شیرانی، ڈاکٹر عبداللہ اور رام بابو سکسینہ نے تحقیق و تنقید کو ساتھ ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ وقار عظیم، ابو اللیث صدیقی اور عبادت بریلوی ادب کی سماجی حیثیت کے نقیب ہیں۔

تاریخ نویسی شبلی کی ادبی شخصیت بڑی متنوع ہے لیکن تاریخ اُن کا خاص میدان ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو فلسفہ تاریخ سے روشناس کرایا۔ اُن کے نزدیک تاریخ

محض واقعات کا بے ترتیب انبار نہیں بلکہ علت و معلول کا وسیع سلسلہ ہے۔ اُن کی سوانح عمریوں کا نقطۂ نظر حالی سے مختلف ہے۔ اُن کا وہی نظریہ ہے جو کارلائیل کا تھا یعنی تاریخ بڑے آدمیوں کے کارناموں کے سلسلہ کا نام ہے شبلی نے عملی و نظری تنقید کے بلند نمونے بھی پیش کئے "سیرت النبی" "الفاروق" "شعر العجم" اور "موازنۂ انیس و دبیر" شبلی کے وہ نقوش ہیں جو گردش شب و روز سے بے نیاز ہیں۔ شبلی کو سلیمان ندوی جیسا جانشین ملا جس نے شبلی کی تحقیق و تاریخ نویسی کی روشن کی ہوئی شمع کی لو اور بھی تیز کر دی۔ مولانا عبدالحی اور مولانا عبدالسلام ندوی بھی اسی دبستانِ فکر کے ممتاز نمائندے ہیں۔ عبدالرزاق کانپوری مصنف البرامکہ، سید ہاشمی فرید آبادی اور باری مرحوم نے بھی اردو کے تاریخی ادب میں وقیع اضافے کئے۔ اردو زبان کے دوسرے اہم مورخ مولانا ذکاء اللہ اور سید علی بلگرامی ہیں۔

اُردو ناول

نذیر احمد نے اپنی ایک جنبشِ قلم سے داستانوں کے دور کو ختم کر کے اُردو میں ناول نگاری کی ابتدا کی۔ ویسے تو وہ مترجم قرآن ہیں مہدی الافادی اُن کی بے پناہ عربیت کے مداح ہیں لیکن ادب میں اُردو کے ایک باکمال ناول نگار کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔ میرزا ظاہر دار بیگ اُردو کے افسانوی ادب میں خوجی کے سوا کسی دوسرے مزاحیہ کردار سے کم نہیں۔ اُن کے ناولوں میں ایک تہذیبی کش مکش کی عظیم کہانی ملتی ہے۔ توبۃ النصوح اور ابن الوقت اس لحاظ سے ہمیشہ دلچسپی کے ساتھ پڑھے جائیں گے

نذیر احمد کے بعد سرشار اور شرر کے قلم نے اردو ناول نگاری کے

قافلہ کو نئی منزلوں تک پہنچایا۔ "فسانۂ آزاد" اُردو کے چند غیر فانی کارناموں میں سے ایک ہے۔ فسانۂ آزاد کی عظمت اُس کی کہانی میں نہیں بلکہ سرشار کے اندازِ نگارش اور فسانہ کے تہذیبی پس منظر سے اس کی ابدیت وابستہ ہے۔ سرشار جیسا ترجمان لکھنؤ کے معاشرہ کو پھر کبھی نہیں ملا۔ فسانۂ آزاد کا خوجی اُردو کا سب سے بڑا مزاحیہ کردار ہے۔ بڑی بات یہ کہ اُس کے عناصر ترکیبی وہی ہیں جو آزاد کے ہیں لیکن عدم توازن نے اُسے وہ کچھ بنا دیا جو وہ ہمیں فسانۂ آزاد میں نظر آتا ہے۔ سرشار کے یہاں پلاٹ کے اُس تسلسل کا فقدان ہے جسے ناول کا لازمی حصّہ سمجھا جاتا ہے۔ شرر نے اپنے پیشروؤں سے ہٹ کر اپنے لئے نیا راستہ تلاش کیا۔ اُن سے اردو میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ شرر پلاٹ کی تعمیر کا گُر نذیر احمد اور سرشار سے بہتر جانتے تھے۔ اُن کے فن پر مغربی اثرات غالب ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سر والٹر اسکاٹ کی ایک ناول پڑھ کر ہی اسلامی تاریخ کو ناول کے روپ میں پیش کرنے کا خیال اُن کے ذہن میں آیا۔ اُن کے یہاں اگر کوئی خامی ہے تو یہ کہ اُن کے کردار یکساں ہیں۔ بقول ایک نقاد انہوں نے ایک ہی قسم کے کپڑے مختلف کھونٹیوں پر ٹانگ دیے ہیں۔ سجاد حسین نے ظریفانہ ناولوں کا آغاز کیا۔ اُن کی ظرافت میں افادی پہلو ہے۔ وہ کرداروں کی تعمیر و تشکیل کا اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ "حاجی بغلول" اس کی زندہ مثال ہے۔ میرزا ہادی رسوا نے ویسے تو کئی ناولیں لکھیں لیکن "امراؤ جان ادا" اُن کا شاہکار ہے اُس کا اندازِ بیان بجائے خود ایک تکنیک ہے۔ اردو میں سوانحی ناولوں کے وہ موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ خاتم یوں کہ اُن سے بہتر سوانحی ناول اور کسی نے نہیں لکھے۔ اپنے فن کے بارے میں مرزا رسوا

نے "ذاتِ شریف" میں لکھا ہے کہ "ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں اور نہ کامیڈی نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے ہیں اور نہ اُن میں سے کسی نے خودکشی کی ہو نہ ہجر ہوا ہے نہ وصل۔ ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیئے"

اس عہد کے ناول نگاروں میں محمد علی طبیب بھی نظر انداز نہیں جا سکتے راشد الخیری نے ایک مقصد کے تحت ناول نویسی شروع کی اور وہ مقصد تھا طبقۂ نسواں کی بہبودی۔ راشد الخیری نے عورتوں کے مسائل و مصائب کو بڑی دردمندی سے پیش کیا ہے اسی لیئے انہیں "مصورِ غم" کہا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے یہاں ٹریجڈی کا کوئی بلند تصور نہیں ملتا۔ ان فنکاروں کے بعد سے پریم چند تک اُردو ناول کا ارتقا جیسے رُک گیا۔ چند اہلِ قلم اِس صنف ادب کے قائم شدہ معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ نیاز فتحپوری نے دو ناولٹ "شاعر کا انجام" اور "شہاب کی سرگزشت" لکھے۔ میرزا محمد سعید دہلوی کا ناول "خوابِ یاسمین" تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ بیسویں صدی میں پریم چند کے ساتھ ناول نگاری کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ پریم چند نے زندگی کو مجموعی طور پر دیکھا۔ اُن کے ناول میں زندگی کی وسعتیں اور ہندوستان کی حقیقی روح ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جو نسل پیدا ہوئی وہ ہمارے ادب میں نیا شعور لے کر آئی۔ دوسری جنگ سے پہلے اردو ادب عالمی انقلابات سے بہت قریب ہو گیا۔ اس دور کی ناول نگاری کی ابتدا سجاد ظہیر کے ناولٹ "لندن کی ایک رات" سے ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ناول نگاری کو بھی فروغ دیا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد ہمارے ادیب ناول کی طرف متوجہ ہوئے۔ کرشن چندر نے "شکست" لکھی۔ عصمت نے "ضدی" اور "ٹیڑھی لکیر" لکھ کر نئی سمتوں کی نشان دہی کی۔ عزیز احمد نے تو اپنی

صلاحیتوں کو بڑی حد تک ناول کے لئے وقف کر دیا۔ قرۃ العین حیدر اور محمد احسن فاروقی بھی آج کے ممتاز ناول نگار ہیں۔

اُردو ڈرامہ

اُردو میں ڈرامہ کی ابتدا ۱۸۵۳ء میں امانت کی اندر سبھا سے ہوتی ہے۔ نظم بہت دنوں تک ڈرامہ کی مملکت پر حکمرانی کرتی رہی لیکن نثر نے آہستہ آہستہ قبضہ جما لیا۔ اردو ڈرامہ کے ارتقا میں پارسیوں کی کمپنیوں کا اہم حصہ ہے مگر ان کمپنیوں نے ادبی معیار پر لوگوں کے عامیانہ مذاق کو ہمیشہ ترجیح دی۔ طالب بنارسی، احسن لکھنوی اور بیتاب دہلوی ان کمپنیوں کے اوّلین ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے بعد آغا حشر کاشمیری نے تجارتی حدود و قیود پر فتح پا کر اچھا ادبی معیار قائم کیا اسی لئے اُن کے ڈراموں کو اُردو کے ادب العالیہ میں بلند جگہ دی جاتی ہے۔ آغا حشر نے نثر کو اُس کا جائز مقام دیا۔ اُن کے مکالمے کرداروں کے حسبِ حال ہوتے ہیں۔ آغا حشر کا نام آج بھی اردو ڈرامہ کا سب سے اہم نام ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے بعد اُردو ڈرامہ نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ اسٹیج کے بغیر ڈرامہ ترقی نہیں کر سکتا۔ آغا حشر کے بعد اُردو ڈرامہ کی تاریخ میں اُمراؤ علی، منشی رحمت علی اور حکیم احمد شجاع نے اچھے ڈرامے لکھے۔ موجودہ دَور کا بہترین ڈرامہ انار کلی ہے۔ امتیاز علی تاج نے انار کلی لکھ کر اردو ڈرامہ کی بڑی خدمت کی ہے، یہ ڈرامہ اُردو کے تمثیلی ادب کی متاعِ گراں قدر ہے۔ اشتیاق حسین قریشی، محمد عمر نور الٰہی، پروفیسر مجیب اور انصار ناصری نے بھی اچھے سماجی اور تاریخی ڈرامے لکھے —— ریڈیو اور فلم نے ڈرامہ کی تکنیک کو بہت متاثر کیا۔ ریڈیو کی وجہ سے مختصر اور یک بابی ڈراموں کو فروغ ہوا۔ امتیاز علی تاج، کرشن چندر سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک،

ناصر شمسی، میرزا ادیب اور جاوید اقبال وغیرہ نے گزشتہ چند سالوں میں اُردو ڈرامہ کو آگے بڑھایا —— لیکن ترقی یافتہ اسٹیج کی کمی نے ان کوششوں کو صرف کاغذ یا ریڈیو تک محدود رکھا ہے۔

اُردو افسانہ

افسانہ کی ابتدا کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا آج کل افسانہ کی "تکنیک" کا تصور بدل گیا ہے اور اس کے پیشِ نظر نیرنگِ خیال کے مضامین کو بھی افسانوی ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مولانا راشد الخیری نے بھی افسانے لکھے۔ پریم چند کی شخصیت نے افسانہ کو مستقل صنفِ ادب بنا دیا۔ پریم چند کے افسانے شاعر کے تخیل، مصور کے موقلم اور عورت کے دل کا امتزاج ہیں۔ اُن کے افسانے تکنیک کے اعتبار سے مکمل ہیں۔ اُن کے موضوعات میں بے حد وسعت تھی، پریم چند نے اردو افسانہ کو زندگی کا نقش گر بنا دیا۔ انہی کے دور میں نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، ل۔ احمد اور مجنوں گورکھپوری کے افسانے ملتے ہیں۔ ان کا تصورِ فن پریم چند سے مختلف تھا۔ وہ ادب میں خیالی جزیرے بنا رہے تھے اور زندگی کی گرم آنچ سے اُن کا فن بے بہرہ تھا۔ ہاں اُن کی صناعی اور ادبی دل آویزی سے انکار نہیں۔ پریم چند کو علی عباس حسینی، اعظم کریوی اور سدرشن جیسے مقلد ملے جنہوں نے انہی کی طرح ہندوستانی زندگی کے خدوخال افسانہ کے آئینے میں پیش کئے۔ پریم چند جدید اُردو افسانہ کے معمار ہیں، اُن کا آخری افسانہ "کفن"، ترقی پسند تحریک کا پہلا افسانہ قرار دیا جاتا ہے۔ پریم چند کے بعد اُردو افسانہ نے بے حد ترقی کی، آج ہمیں اُردو افسانہ میں تکنیک اور موضوعات کا حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک اُردو افسانہ برابر آگے بڑھتا رہا۔ آج اُردو کے افسانوی ادب میں جمود تو نہیں لیکن کسی قدر انحطاط ضرور نظر

آتا ہے۔ پروفیسر احمد علی، رشید جہاں، اختر انصاری، اختر رائے پوری، حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی اور فیاض محمود وغیرہ نے پریم چند کے بعد تکنیک کے تجربے کئے، ان سب کی فنی انفرادیت مسلّم ہے۔ اِن کے بعد اُردو افسانہ کو کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی جیسے فن کار ملے اِن میں سے ہر ایک کا فن اپنی جگہ مطالعہ کا موضوع ہے۔ کرشن چندر رومانیت کی منزل سے حقائق کی دنیا میں پہنچے، انہوں نے طویل مختصر افسانے اور بغیر پلاٹ کے افسانے لکھے، اُن کے افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت انسان دوستی ہے۔ منٹو نے سوسائٹی کے بدنام افراد اور طبقوں کے سینوں میں انسانیت کی روشنی تلاش کی، اُن کے افسانے تکنیک کے اعتبار سے بڑے مکمل ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں وہ جنسی معکوسیت سے دامن بچا لیتے ہیں زندگی کی کوئی سنگین حقیقت ہمیں دے جاتے ہیں۔۔۔ عصمت مسلمانوں کے درمیانی طبقے کی گھریلو زندگی کی ترجمان ہیں۔ بیدی کے افسانے ٹھوس حقیقت نگاری کے نمونے ہیں۔ بیدی کے یہاں سستی جذباتیت کہیں نہیں، وہ تو انسانی جذبات کے مطالعہ کو فن سمجھتے ہیں۔ آج کے دوسرے اہم افسانہ نگار غلام عباس، ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری، بلونت سنگھ خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر اور ہاجرہ مسرور وغیرہ ہیں۔

طنز و مزاح

اُردو نثر میں مزاح کی بہار پہلی مرتبہ خطوطِ غالب میں نظر آتی ہے۔ اُس کے بعد منشی سجاد حسین کی ادارت میں "اودھ پنچ" کا اجرا ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اودھ پنچ میں اچھے مزاح نگاروں کا ایک منتخب اجتماع تھا۔ میر محفوظ علی بدایونی کی ذہانت نے ذہنی شگفتگی کے بہت ہی خوبصورت پھول کھلائے۔ میر محفوظ علی کے مرتبہ کا تعین ہمارے نقادوں نے صحیح طور پر نہیں کیا کیونکہ اب تک اُن کے مضامین یکجا نہیں

شائع کیے جاسکے۔ عہد حاضر میں طنز و مزاح نے مثالی ترقی کی ہے۔ فرحت اللہ بیگ کا مزاح "خوش مذاقی" کا نمونہ ہے مشرقی و مغربی تہذیب کی کشمکش ان کا محبوب موضوع ہے اور زبان پر قدرت نے اُن کے طنز کو "تیر نیم کش" بنا دیا۔ رشید احمد صدیقی نے مزاح میں نئے عناصر کا اضافہ کیا، اُن کی سی ادبیت کسی اور مزاح نگار کے یہاں نہیں۔ اکبر کی طرح مخصوص اشاروں سے انھوں نے بھی بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ رشید صاحب کے یہاں مقامی رنگ اور علی گڑھ کا تذکرہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ مختلف النوع باتوں میں جس طرح ربط پیدا کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ پطرس نے روزمرہ کے واقعات میں مزاح کے انوکھے پہلو تلاش کیے اور چند مضامین ہی لکھ کر صفِ اول کے مزاح نویسوں میں اپنی جگہ بنالی۔ عظیم بیگ چغتائی کے یہاں بلا کی حرکت ہے۔ اُن کا مزاح پلاٹ اور واقعات کا مزاح ہے اور یہی بات تمام دوسرے مزاح نگاروں سے انہیں منفرد کر دیتی ہے۔ شوکت تھانوی نے ویسے تو بہت کچھ لکھا ہے لیکن سودیشی ریل کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ مزاحیہ خاکے اُن کی اولیات میں سے ہیں۔ کنہیا لال کپور کے یہاں طنز کا رنگ زیادہ گہرا ہے، وہ بنیادی طور پر مزاح نویس نہیں بلکہ طنز نگار ہیں۔

اُردو صحافت

سرسید کے "تہذیب الاخلاق" نے اردو صحافت کو ایک قوت اور اصلاحِ معاشرت کا ذریعہ بنا دیا۔ سرسید نے اُردو صحافت کو جس مقامِ بلند تک پہنچا دیا تھا۔ آج کی صحافت میں وہاں نظر نہیں آتی لیکن درمیانی عرصہ میں اردو صحافت نے اس مرتبہ اور سطح کو یقیناً قائم رکھا۔ مولانا محمد علی کے "ہمدرد" سید جالب کے "ہمدم" اور مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" و "البلاغ" کے نام مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ الہلال تو

ایک کوہِ آتش فشاں تھا اور فرنگی سامراج نے ہمیشہ اپنے آپ کو اس کی آتش فشانیوں کی زد میں پایا۔ مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" نے جنگِ آزادی کی رفتار کو بڑھا دیا۔ عبدالماجد دریابادی نے صدق میں "سچی باتیں" لکھ کر ایک مخصوص انداز قائم کر دیا۔ قاضی عبدالغفار، عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر اور چراغ حسن حسرت موجودہ دور کے سب سے ممتاز صحافی ہیں۔

ادبی صحافت یعنی رسائل و جرائد نے بھی ارتقاء کی کئی منزلیں طے کیں، اور دلگداز، مخزن، نقاد آگرہ، زمانہ، اردوئے معلّٰی، علی گڑھ میگزین، معارف، اردو، ادیب، نگار، الناظر عالمگیر، ہمایوں، نیرنگِ خیال، ادبی دنیا، ساقی، ادبِ لطیف، سویرا اور نقوش وغیرہ رسالے نہیں بلکہ انہیں منزلوں کے سنگِ میل ہیں۔

اُردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز اس جائزہ میں اردو کے نثر نگاروں کا تذکرہ موضوعات کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ اسی لئے اُردو کے صاحبِ طرز انشا پردازوں کا ذکر نہیں آسکا۔ رجب علی بیگ سرور، محمد حسین آزاد، شبلی، رتن ناتھ سرشار اور ابوالکلام آزاد کے علاوہ اُردو نے جو صاحبِ طرز انشا پرداز پیدا کئے ہیں وہ اپنے موضوع کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلوب کی وجہ سے زندہ رہیں گے —— یہ انشا پرداز اُردو زبان کے گہواروں سے تعلق رکھتے ہیں اور میر امّن کی طرح اس بات پر نازاں کہ دلّی اور لکھنؤ کے روڑے ہیں —— اسلوب کی اہمیت کا اندازہ شبلی کے اس جملے سے کیجئے جو انہوں نے محمد حسین آزاد کے متعلق لکھا تھا کہ وہ گپ بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔ ویسے تو ہر ادیب کا اپنا رنگ اور انداز ہوتا ہے لیکن یہاں اُن بزرگوں کا ذکر مقصود ہے جو اپنے اسالیب کی جنت میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ —— خواجہ حسن نظامی، نذیر ناصر فراق دہلوی، سید احمد دہلوی، میر باقر علی

داستان گو، خواجہ عبدالرؤف عشرت، سجاد انصاری، چودھری محمد علی ردولوی اور سلطان حیدر جوش ایسے انشاء پرداز ہیں جنہوں نے زندگی کے رنگا رنگ تجربوں کو اسلوبِ نگارش بنا دیا، ان کی زبان ہمارے بیشتر ادیبوں کی طرح کتابی نہیں بلکہ ان کی زبان نے زندگی اور صدیوں کی روایات کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

اُردو نثر کے اس مختصر جائزے کے بعد ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نثر کا کارواں خوب سے خوب تر کی جستجو میں آگے بڑھ رہا ہے، زندگی کی قوتوں سے ہمارے ادب کا رشتہ بہت استوار ہے۔ اُردو ادب میں ایسی لچک ہے کہ وہ ہر ادبی سعادت اور خوبی کو اپنی میراث سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ مغربی اصنافِ ادب مثلاً ناول، افسانہ اور ڈرامہ آج ہمارے نثری ادب کا ایسا حصہ ہیں کہ ان کے بغیر ہم اپنے ادب کا تصور بھی نہیں کر سکتے ـــــ عالمی ادب کے کتنے ہی صحت مند عناصر، اسالیب اور اصناف اُردو میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں اور اس طرح کہ وہ اس انجمنِ ناز میں سب اپنے ہی نظر آتے ہیں، بیگانہ صفتی کو ہماری ادبی روایات نے اپنائیت میں بدل دیا ہے۔

پیشِ نظر انتخاب | گو ہم نے اُردو نثر کی رفتار کا آئینہ بنانے کی کوشش کی ہے ـــ تاریخی ارتقاء کو پیش کرنے کے علاوہ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اُردو نثر کے تنوع کا اندازہ بھی اس انتخاب سے ہو سکے۔ اس میں تنقید کے نمونے بھی ہیں اور داستانوں کے اقتباس بھی، ناولوں کے ٹکڑے بھی ہیں اور نمائندہ افسانے بھی، سفرنامہ بھی ہے اور یادِ رفتگاں بھی ـــ

آداب معاشرت بھی ہیں اور اجڑے ہوئے تہذیبی گہواروں کے نقوش بھی۔ نثری اسالیب کی نمائندگی ہی ہمارا مقصد رہی ہے۔ ہمیں تنگ دامانی کا احساس ہے لیکن اس دامن میں جو پھول ہیں، اُن پر "آب حیات" شبنم بن کر برسی ہے تاکہ شادابی پر کملاہٹ کا اثر نہ ہو۔

خطوط کے لئے ایک علیحدہ باب قائم کیا گیا ہے۔ اب تک نثری ادب کے انتخابات میں خطوط کو زیادہ درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ حالانکہ اس صنفِ ادب میں شخصیتیں جس طرح ہمارے سامنے پیش آتی ہیں وہ قربت اور صداقت کسی اور صنفِ ادب میں ممکن نہیں — ادب قانونی دستاویز نہیں بلکہ شخصیتوں کی جلوہ گری کا دوسرا نام ہے، غالب کے ہم عصر غلام غوث بےخبر کو بھی اب تک نظرانداز کیا گیا ہے۔ لیکن اس انتخاب میں ان کی شمولیت پہ ہم نازاں ہیں۔

سید ابوالخیر کشفی بی۔ اے (آنرز)

ایم۔ اے

(صدر شعبۂ اردو)

اسلامیہ کالج۔ کراچی

۳۱ر اکتوبر
سنہ ۱۹۵۵ء

انتخاب نثر

میر امن دہلوی

اصل نام میر امان تھا اور تخلص لطف - ان کے آبا و اجداد شہنشاہ ہمایوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے - ان کا خاندان آخری مغل تاجدار تک حکومت کا وفادار اور جاں نثار رہا - میر امن کو اپنے دہلوی ہونے پر ناز اور دہلی کی تباہی پر بڑا قلق تھا - غرض احمد شاہ ابدالی کی لوٹی کھسوٹی اُجڑی ہوئی دلّی میں تیس چالیس سال گذارے - آخر تنگدستی کی بدولت یہاں سے نکل کھڑے ہوئے - اور عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے - جب یہاں گذر بسر کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو کلکتہ کا رُخ کیا - نواب دلاور جنگ نے اپنے چھوٹے بھائی کاظم خاں کا اتالیق مقرر کر دیا لیکن یہ نوکری دو سال سے زیادہ نہ نبھی - اسی زمانہ میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بنیاد پڑی - تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں کو اُردو سکھائی جائے - ڈاکٹر جان گلکرسٹ منتظم فورٹ ولیم کالج کی فرمائش سے میر امن نے فارسی قصّہ "چہار درویش" کو اُردو میں منتقل کیا - اور اس کا تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا - میر امن نے یہ قصّہ ۱۸۰۲ء میں لکھکر تمام کیا - افسوس کہ میر امن کی زندگی کے حالات اس سے زیادہ منظر عام پر نہیں آئے - اس لئے ہمیں نہ اُن کے سالِ ولادت کا علم ہے اور نہ سالِ وفات کا -

میر امن کی اُردو نثر کا ہماری زبان میں وہی درجہ ہے جو میر تقی میر کا نظم میں ہے - اگرچہ اس کتاب کی زبان اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے کی ہے - مگر

اس کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا نہایت سلیس و بامحاورہ زبان ہے۔ زبان کے علاوہ یہ اپنے زمانہ کے رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کا نگارخانہ ہے۔ جس میں ہر رنگ کے مرقعے پوری وضاحت کے ساتھ نظر آجاتے ہیں دل چسپی کا یہ عالم ہے کہ اس کتاب کو شروع نہ کرنے کا تو اختیار ہے۔ لیکن شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہاتھ سے رکھ دینا ناممکن!

باغ و بہار کے علاوہ میر امن کی دوسری کتاب "گنجِ خوبی" ہے۔ جو ملا حسین واعظ کاشفی کی "اخلاقِ محسنی" کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی میر صاحب کی سنجیدگی اور متانت حرف حرف سے نمایاں ہے۔ کہتے ہیں کہ میر امن کا دیوان ضائع ہوگیا۔

خواجہ سگ پرست کی کہانی

خواجہ نے کہا۔ اے بادشاہ! یہ مرد جو داہنی طرف ہے۔ غلام کا بڑا بھائی ہے اور جو بائیں کو کھڑا ہے منجھلا ہے۔ میں ان دونوں سے چھوٹا ہوں۔ میرا باپ ملک فارس میں سوداگر تھا جب میں چودہ برس کا ہوا، قبلہ گاہی نے رحلت کی۔ جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول اُٹھ چکے۔ ان دونوں بھائیوں نے مجھے کہا کہ اب باپ کا مال جو کچھ ہے تقسیم کریں جس کا دل جو چاہے سو کرے۔ میں نے سُن کر کہا اے بھائیو! یہ کیا بات ہے؟ میں تمہارا غلام ہوں۔ بھائی چارے کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ ایک باپ مرگیا۔ تم دونوں میرے بزرگ جگہ میرے سر پر قائم ہو۔ ایک نانِ خشک چاہتا ہوں جس سے زندگی بسر کروں اور تمہاری خدمت میں حاضر رہوں۔ مجھے حصے بخرے سے کیا کام ہے؟ تمہارے آگے

کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھروں گا۔ اور تمھارے پاس رہوں گا۔ میں لڑکا ہوں کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ مجھ سے کیا ہو سکے گا۔ ابھی تم مجھے تربیت کرو۔

یہ سُن کر جواب دیا کہ تو چاہتا ہے اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور محتاج کرے۔ میں چپکا ایک گوشے میں جا کر رونے لگا۔ پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بزرگ ہیں۔ میری تعلیم کی خاطر چشم نمائی کرتے ہیں۔ کہ کچھ سیکھے۔ اسی فکر میں سو گیا صبح کو ایک پیادہ قاضی کا آیا۔ اور مجھے دارالشرع میں لے گیا۔ وہاں دیکھا تو یہی دونوں بھائی حاضر ہیں۔ قاضی نے کہا۔ کیوں اپنے باپ کا ورثہ بانٹ چونٹ نہیں لیتا؟ میں نے گھر میں جو کہا تھا وہاں بھی وہی جواب دیا۔ بھائیوں نے کہا اگر یہ بات اپنے دل سے کہتا ہے تو ہمیں لا دعویٰ لکھ دے کہ باپ کے مال و اسباب سے مجھے کچھ علاقہ نہیں۔ تب بھی میں نے یہی سمجھا کہ یہ دونوں میرے بزرگ ہیں، میری نصیحت کے واسطے کہتے ہیں۔ کہ باپ کا مال لے کر بے جا تصرف نہ کرے۔ بموجب اُن کی مرضی کے فارغ خطی بہ مُہر قاضی میں نے لکھ دی۔ یہ راضی ہوئے، میں گھر آیا۔ دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے۔ اے بھائی! یہ مکان جس میں تو رہتا ہے ہمیں درکار ہے۔ تو اپنی بود و باش کی خاطر اور جگہ لے کر جا رہ۔ تب میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ بابا کی حویلی میں بھی میرے رہنے سے خوش نہیں۔ لاچار ارادہ اُٹھ جانے کا کیا۔ جہاں پناہ! جب میرا باپ جیتا تھا تو جس وقت سفر سے آتا ہر ایک مُلک کا تحفہ بطریق سوغات لاتا اور مجھے دیتا۔ اس واسطے کہ چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے۔ میں نے اُن جمع شدہ تحائف کو بیچ بیچ کر تھوڑی سی اپنی بچ کی پونجی بہم پہنچائی تھی۔ اسی سے کچھ خرید و فروخت کرتا۔ ایک بار ایک لونڈی میری خاطر ترکستان سے میرا باپ لایا۔ ایک دفعہ گھوڑے لے کر آیا۔ ان میں سے ایک بچھیرا اتنا کنہ کہ ہونہار تھا وہ بھی

مجھے دیا۔ میں اپنے پاس سے دانہ گھاس اس کو کرتا تھا۔

آخر اُن کی بے مروتی دیکھ کر ایک حویلی خرید کی۔ وہاں جا رہا۔ یہ کتا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ واسطے ضروریات کے اسباب خانہ داری کا جمع کیا۔ اور دو غلام خدمت کی خاطر مول لئے۔ اور باقی پونجی سے ایک دُکان بزازی کی کر کے خدا کے توکل پر بیٹھا۔ اپنی قسمت پر راضی تھا۔ اگرچہ بھائیوں نے بد خلقی کی۔ پر خدا جو مہربان ہوا۔ تین برس کے عرصے میں ایسی دُکان جمی کہ میں صاحب اعتبار ہوا۔ سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہتا میری ہی دُکان سے جاتا۔ اس میں بہت سے روپے کمائے۔ اور نہایت فراغت سے گذرنے لگی۔

اتفاقاً جمعے کے روز میں اپنے گھر بیٹھا تھا۔ کہ ایک غلام میرا سودے سلف کو بازار گیا تھا۔ بعد ایک دم کے روتا ہوا آیا۔ میں نے سبب پوچھا کہ تجھے کیا ہوا؟ خفا ہو کر بولا کہ تمھیں کیا کام ہے؟ تم خوشی مناؤ۔ لیکن قیامت میں کیا جواب دوگے؟ میں نے کہا اے حبشی ایسی کیا بلا تجھ پر نازل ہوئی؟ اُس نے کہا یہ غضب ہے کہ تمھارے بڑے بھائیوں کی چوک کے چوراہے میں ایک یہودی نے مشکیں باندھی ہیں۔ اور قمچیاں مارتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اگر میرے روپے نہ دوگے تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا۔ بھلا مجھے ثواب تو ہوگا۔ پس تمھارے بھائیوں کی یہ نوبت اور تم بے فکر ہو، یہ بات اچھی ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟ یہ بات غلام سے سُنتے ہی لہو نے جوش مارا۔ ننگے پاؤں بازار کی طرف دوڑا اور غلاموں کو کہا۔ جلد روپے لے کر آؤ۔ جونہی وہاں گیا دیکھا تو جو کچھ غلام نے کہا تھا سچ ہے۔ اُن پر مار پڑ رہی ہے۔ حاکم کے پیادوں کو کہا۔ واسطے خدا کے ذرا ٹھیر جاؤ۔ میں یہودی سے پوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے جس کے بدلے میں یہ تعزیر

کی ہے؟ یہ کہہ کر میں یہودی کے نزدیک گیا۔ اور کہا۔ آج روز آدینہ ہے۔ اُن کو کیوں ضربِ شلاق کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ اگر حمایت کرتے ہو تو پوری کرو۔ اُن کے عوض روپئے حوالے کرو۔ نہیں تو اپنے گھر کی راہ لو۔ میں نے کہا کیسے روپئے؟ دست آویز نکال میں روپئے گِن دیتا ہوں۔ اُس نے کہا۔ تمسک حاکم کے پاس دے آیا ہوں۔ اتنے میں میرے دونوں غلام دو بدرے لے کر آئے۔ ہزار روپئے میں نے یہودی کو دیئے۔ اور بھائیوں کو چھڑایا۔ اُن کی یہ صورت ہو رہی تھی کہ بدن سے ننگے، اور بھوکے پیاسے، اپنے گھر لایا۔ اور انہیں حمام میں نہلوایا، نئی پوشاک پہنائی۔ کھانا کھلایا۔ ہرگز اُن سے یہ نہ کہا کہ اتنا مال باپ کا تم نے کیا کیا؟ شاید شرمندہ ہوں۔

اے بادشاہ! یہ دونوں موجود ہیں۔ پوچھئے! سچ کہتا ہوں یا کوئی بات جھوٹ بھی ہے؟ خیر جب کئی دن میں مار کی کوفت سے بحال ہوئے، ایک روز میں نے کہا اے بھائیو! اب اس شہر میں تم بے اعتبار ہو گئے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ چند روز سفر کرو۔ یہ سُن کر چپ ہو رہے۔ میں نے معلوم کیا کہ راضی ہیں۔ سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بال پر تل بار برداری اور سواری کی فکر کر کے بیس ہزار روپئے کی جنس تجارت خرید کی ایک قافلہ سوداگروں کا بخارا کو جاتا تھا اُن کے ساتھ کر دیا۔

بعد ایک سال کے وہ کارواں پھر آیا۔ اُن کی خیر خبر کچھ نہ پائی۔ آخر ایک آشنا سے قسمیں دے کر پوچھا۔ اُس نے کہا جب بخارا میں گئے، ایک نے جوئے خانہ میں اپنا تمام مال ہار دیا۔ اب وہاں کی جاروب کشی کرتا ہے۔ اور پھڑ کو لیپتا پوتتا ہے۔ جُواری جو جمع ہوتے ہیں ان کی خدمت کرتا ہے۔ وے بطریق خیرات کے کچھ دیدیتے ہیں۔ وہاں گرگا بنا پڑا رہتا ہے۔ اور دوسرا ابوزہ فروش کی لڑکی پر عاشق ہوا۔ اپنا سارا مال صرف

کیا۔ اب وہ بوزہ خانہ کی ٹہل کیا کرتا ہے۔ قافلہ کے آدمی اس لئے نہیں کہتے کہ تو شرمندہ ہوگا۔

یہ احوال اُس شخص سے سُن کر میری عجیب حالت ہوئی۔ مارے فکر کے نیند بھوک جاتی رہی۔ زادِ راہ لے کر قصد بخارا کا کیا۔ جب وہاں پہنچا، دونوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مکان میں لایا غسل کروا کر نئی پوشاک پہنائی۔ اور اُن کی خجالت کے ڈر سے ایک بات مُنہ پر نہ کہی۔ پھر مال سوداگری کا اُن کے واسطے خریدا۔ اور ارادہ گھر کا کیا۔ جب نزدیک نیشاپور کے آیا۔ ایک گاؤں میں مع مال و اسباب ان کو چھوڑ کر گھر میں آیا۔ اس لئے کہ میرے آنے کی کسی کو خبر نہو۔ بعد دو دن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں کل اُن کے استقبال کی خاطر جاؤں گا۔ صبح کو چاہا کہ جاؤں۔ ایک گرہست اسی موضع کا میرے پاس آیا۔ اور فریاد کرنے لگا۔ میں اُس کی آواز سُن کر باہر نکلا۔ اُسے روتا دیکھ کر پوچھا کہ کیوں زاری کرتا ہے؟ وہ بولا تمہارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لوٹے گئے۔ کاش کہ اُن کو تم وہاں نہ چھوڑ آتے۔

میں نے پوچھا کہ کیا مصیبت گذری؟ بولا کہ رات کو ڈاکا آیا، اُن کا مال و اسباب لوٹا اور ہمارے گھر بھی لُوٹ لئے گئے۔ میں نے افسوس کیا اور پوچھا کہ اب وے دونوں کہاں ہیں؟ کہا کہ شہر کے باہر ننگے منگے خراب خستہ بیٹھے ہیں۔ دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ لے کر گیا۔ پہنا کر گھر میں لایا۔ لوگ سُن کر اُن کو دیکھنے کو آتے تھے۔ اور یہ مارے شرمندگی کے باہر نہ نکلتے تھے۔ تین مہینے اسی طرح گذرے۔ تب میں نے اپنے دل میں غور کیا کہ کب تک یہ کونے میں دُبکے بیٹھے رہیں گے؟ اب تو اُن کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاؤں۔

بھائیوں سے کہا۔ اگر فرمائیں تو یہ فدوی آپ کے ساتھ چلے۔ یہ خاموش رہے، پھر لوازمہ سفر کا اور جنس سوداگری کی تیار کر کے چلا۔ اوران کو ساتھ لیا جس وقت مال کی زکوٰۃ دے کر اسباب کشتی پر چڑھایا۔ اور لنگر اُٹھایا۔ ناؤ چلی، یہ کتا کنارے پر سو رہا تھا۔ جب چونکا اور جہاز کو مانجھ دھار میں دیکھا، حیران ہو کر بھونکا اور دریا میں کود پڑا اور پیرنے لگا۔ میں نے ایک پنسوئی دوڑا دی۔ بارے سگ کو لے کر کشتی میں پہنچایا۔ ایک مہینہ خیر و عافیت سے دریا میں گذرا۔ کہیں منجھلا بھائی ایک دن بڑے بھائی سے کہنے لگا۔ چھوٹے بھائی کی منت اُٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل ہوئی۔ اس کا تدارک کیا کریں؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں ٹھیرائی ہے۔ اگر بن آوے تو بڑی بات ہے۔ آخر دونوں نے مصلحت کر کے تجویز کی کہ اسے مار ڈالیں اور سارے مال و اسباب پر قابض و متصرف ہوں۔

ایک دن میں جہاز کی کوٹھری میں سوتا تھا۔ کہ منجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر چونکا اور باہر نکلا۔ یہ کتا بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی باڑ پر ہاتھ ٹیکے نہوڑا ہوا تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے۔ اور مجھے پکارتا ہے۔ میں نے پاس جا کر کہا خیر تو ہے؟ بولا عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے۔ کہ دریائی آدمی موتی کی سیپیاں اور مونگے کے درخت ہاتھ میں لئے ہوئے ناچتے ہیں۔ اگر اور کوئی ایسی بات خلافِ قیاس کہتا تو میں نہ مانتا۔ بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا۔ دیکھنے کو سر جھکایا، ہر چند نگاہ کی۔ کچھ نظر نہ آیا۔ اور وہ یہی کہتا رہا۔ اب دیکھا؟ لیکن کچھ ہو تو دیکھوں۔ اس میں مجھے غافل پا کر منجھلے نے اچانک پیچھے سے آ کر ایسا ڈھکیلا کہ بے اختیار پانی میں گر پڑا۔ اور وے رونے دھونے لگے۔ کہ دوڑیو ہمارا بھائی دریا میں ڈوبا۔

اتنے میں ناؤ بڑھ گئی۔ اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی۔ غوطے پر غوطے کھاتا رہا۔ اور موجوں میں چلا جاتا تھا۔ آخر تھک گیا۔ خدا کو یاد کرتا تھا۔ کچھ بس نہ چلتا تھا۔ ایک بارگی کسی چیز پر ہاتھ پڑا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کتا ہے۔ شاید جس دم مجھے دریا میں ڈالا میرے ساتھ یہ بھی کودا۔ اور پیرتا ہوا میرے ساتھ لپٹا چلا جاتا تھا میں نے اس کی دُم پکڑ لی۔ اللہ نے اس کو میری زندگی کا سبب کیا۔ سات دن اور رات، یہی صورت گذری۔ آٹھویں دن کنارے جا لگے، طاقت مطلق نہ تھی۔ لیٹے لیٹے کروٹیں کھا کر جوں تُوں اپنے تئیں خشکی میں ڈالا۔ ایک دن بے ہوش پڑا تھا۔ دوسرے دن کتے کی آواز کان میں آگئی۔ ہوش میں آیا۔ خدا کا شکر بجا لایا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُور سے سواد شہر کا نظر آیا۔ لیکن قوت کہاں کہ ارادہ کروں، لاچار دو قدم چلتا۔ پھر بیٹھتا۔ اسی حالت سے شام تک کوس بھر راہ کاٹی۔

بیچ میں ایک پہاڑ ملا۔ رات کو وہاں پڑ رہا۔ صبح کو شہر میں داخل ہوا۔ جب بازار میں گیا۔ نانبائی اور حلوائیوں کی دکانیں نظر آئیں۔ دل ترسنے لگا۔ نہ پاس پیسہ جو خریدوں۔ نہ جی چاہے کہ مفت مانگوں۔ اسی طرح اپنے دل کو تسلی دیتا ہوا کہ اگلی دکان سے لوں گا۔ چلا جاتا تھا۔ آخر طاقت نہ رہی اور پیٹ میں آگ لگی۔ نزدیک تھا کہ رُوح بدن سے نکلے۔ ناگاہ دو جوانوں کو دیکھا کہ لباس عجم کا پہنے اور ہاتھ پکڑے چلے آتے ہیں۔ اُن کو دیکھ کر خوش ہوا کہ یہ اپنے ملک کے انسان ہیں۔ شاید آشنا صورت ہیں اُن سے اپنا احوال کہوں گا۔ جب نزدیک آئے تو دونوں میرے برادر حقیقی تھے۔ دیکھ کر نہایت شاد ہوا۔ شکر خدا کا کیا۔ کہ خدا نے آبرو رکھ لی۔ غیر کے آگے ہاتھ نہ پسارا۔ نزدیک جاکر سلام کیا۔ اور بڑے بھائی کا ہاتھ چوما انہوں نے مجھے دیکھتے ہی غل و شور کیا۔

منجھلے بھائی نے طمانچہ مارا۔ کہ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ بڑے بھائی کا دامن پکڑا۔ کہ شاید یہ حمایت کرے گا۔ اُس نے بھی لات ماری۔

غرض دونوں نے مجھے خوب خورد و خام کیا۔ اور حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا سا کام کیا۔ ہرچند میں نے خدا کے واسطے دیئے۔ اور رگھگیایا۔ ہرگز رحم نہ کھایا۔ ایک خلقت اکٹھی ہوئی۔ سب نے پوچھا اس کا کیا گناہ ہے؟ تب بھائیوں نے کہا کہ یہ کم بخت ہمارے بھائی کا نوکر تھا۔ سو اس کو دریا میں ڈال دیا۔ اور مال و اسباب لے لیا۔ ہم مدت سے تلاش میں تھے۔ آج اس صورت سے نظر آیا۔ اور مجھ سے پوچھتے تھے کہ اے ظالم! یہ کیا تیرے دل میں آیا کہ ہمارے بھائی کو مار کھپایا؟ کیا اُس نے تیری تقصیر کی تھی؟ اس نے تجھ سے کیا بُرا سلوک کیا کہ اپنا مختار بنایا تھا؟ پھر اُن دونوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے۔ اور بے اختیار جھوٹ موٹ بھائی کی خاطر روتے تھے۔ اور لاتیں مکّی مجھ پر کرتے تھے۔

اس میں حاکم کے پیادے آئے۔ اور ان کو ڈانٹا کہ کیوں مارتے ہو؟ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئے۔ یہ دونوں بھی ساتھ چلے۔ اور حاکم سے بھی یہی کہا۔ اور بطور رشوت کے کچھ دے کر اپنا انصاف چاہا۔ اور خون ناحق کا دعویٰ کیا۔ حاکم نے مجھ سے پوچھا۔ میری یہ حالت تھی کہ مارے بھوک اور مار پیٹ کے طاقتِ گویائی کی نہ تھی۔ سر نیچے کئے کھڑا تھا۔ کچھ منہ سے جواب نہ نکلا۔ حاکم کو بھی یقین ہوا کہ یہ مقرر خونی ہے۔ فرمایا کہ اسے میدان میں لے جا کر سولی دو۔

جہاں پناہ! میں نے روپے دے کر ان کو یہودی کی قید سے چھڑایا تھا۔ اس کے عوض انہوں نے روپیہ خرچ کر کے میری جان کا قصد کیا۔ یہ دونوں حاضر ہیں۔ ان سے

پوچھے کہ میں اس میں سرِ مو تفاوت کہتا ہوں۔ خیر مجھے لے گئے۔ جب دار کو دیکھا، ہاتھ زندگی سے دھویا۔

سوائے اس کتے کے کوئی میرا رونے والا نہ تھا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک آدمی کے پاؤں میں لوٹتا اور چلاتا تھا۔ کوئی لکڑی کوئی پتھر سے مارتا۔ لیکن یہ اس جگہ سے نہ سرکتا۔ اور میں رو بقبلہ ہو کر خدا سے کہتا تھا کہ اس وقت میں تیری ذات کے سوا میرا کوئی نہیں جو آڑے آوے اور بے گناہ کو بچاوے۔ یہ کہہ کر کلمہ شہادت پڑھ کر تیوراکر گر پڑا۔

خدا کی حکمت سے اس شہر کے بادشاہ کو قولنج کی بیماری ہوئی۔ اُمرا اور حکیم جمع ہوئے۔ جو علاج کرتے تھے۔ فائدہ مند نہ ہوتا تھا۔ ایک بزرگ نے کہا کہ سب سے بہتر یہ دوا ہے کہ محتاجوں کو کچھ خیرات کرو۔ اور قیدیوں کو آزاد کرو۔ دوا سے دعا میں بڑا اثر ہے یہ سنتے ہی بادشاہی چیلے بندی خانوں کی طرف دوڑے۔

اتفاقاً ایک اس میدان میں آنکلا۔ اژدحام دیکھ کر معلوم کیا کہ کسی کو سولی چڑھاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی گھوڑے کو دار کے نزدیک لاکر تلوار سے طنابیں کاٹ دیں۔ حاکم کے پیادوں کو ڈانٹا۔ اور تنبیہ کی کہ ایسے وقت میں کہ بادشاہ کی یہ حالت ہے تم خدا کے بندے کو قتل کرتے ہو! اور مجھے چھڑا دیا۔

(میر امّن دہلوی)

رجب علی بیگ سرور

سرور ۱۲۰۱ھ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی، عربی اور فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ شاعری میں وہ آغا نوازش حسین کے شاگرد تھے ۱۲۴۰ھ میں وہ کان پور چلے گئے۔ کہتے ہیں کہ نواب غازی الدین حیدر والیِ لکھنؤ کے حکم سے وہ جلا وطن کرائے گئے تھے مگر کان پور میں اُن کا جی نہ لگا اور ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ وہ لکھنؤ واپس آجائیں۔ چنانچہ واپس آنے پر واجد علی شاہ کے درباری شعراء کے زمرے میں داخل ہوئے۔ بادشاہ کے حکم سے "شمشیر خانی" کا ترجمہ کیا اور "سرور سلطانی" نام رکھا غدر کے بعد مہاراجہ بنارس کے بلانے پر وہاں چلے گئے۔ مہاراجہ نے بڑی آؤ بھگت کی بنارس میں اُنہوں نے "گلزار سرور" اور "شبستان سرور" کتابیں لکھیں جو انشاء پردازی کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ سن وفات ۱۲۸۴ھ ہے۔

مگر فسانۂ عجائب سرور کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ یہ کتاب کانپور کے قیام میں لکھی گئی تھی۔ اگر آج ان کی کتاب ہمارے کتب خانوں کی زینت نہ ہوتی تو ہم اُردو زبان کی گزشتہ نیرنگیوں سے بہت کم واقف ہوتے۔ دلّی اُجڑی تو لکھنؤ بسا، لکھنؤ نے دلّی سے ہر امر میں سبقت لے جانے کی ضد آخر دم تک جاری رکھی، اور یہ اس کا نتیجہ ہے کہ میر امن کی باغ و بہار سلیس اُردو کا بے نظیر نمونہ ہے تو سرور کا فسانہ مقفٰی اور مسجّع زبان کا نادرِ روزگار نقش؛

ہنگامۂ غدر تک بالعموم ملک کی تحریری زبان مقفّیٰ مسجّع ہی اسی کی تقلید میں یہ پرتکلف اردو رائج ہوئی۔ فسانۂ عجائب اسی طرز کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قافیہ کی پابندی ادائے مطلب میں سنگ راہ ہے، اکثر مقامات پر پڑھنے والا لفظوں کے جال میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور عبارت معمّہ نظر آنے لگتی ہے پھر بھی یہ اپنی وضع کی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔

سرور کی نثرنگاری کی شہرت نے اُن کی شاعری کو زیادہ چمکنے نہیں دیا۔ آج ان کا دیوان موجود نہیں ہے لیکن جو متفرق غزلیں ملتی ہیں، وہ اُن کی اعلیٰ زباں دانی کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ سرور بہت اچھے خطاط بھی تھے۔ ان کی کتاب "گلزار سرور" جو حدائق العشاق کی توجیہ ہے۔ غالب نے اس پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔

سرور اُردو نثر میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

قصۂ شاہِ یمن

سرزمینِ یمن میں ایک بادشاہ تھا۔ ملک اس کا مالا مال۔ دولتِ لازوال بخشندۂ تاج و تخت نیک سیرت، فرخندہ بخت، جس دم سائل کی صدا گوش حق نیوش میں در آئی۔ وہیں احتیاج بھکاری۔ میں بر آئی۔ یہاں تک کہ لقب اس کا خدادوست نزدیک و دور مشہور ہوا۔

ایک روز کوئی شخص آیا۔ اور سوال کیا۔ کہ "اگر تو خدادوست ہے۔ تو للہ تین دن مجھے سلطنت کرنے دے۔" بادشاہ نے فرمایا۔ "بسم اللہ" جو رکن سلطنت مسند

نشین حکومت حاضر تھے۔ بہ تاکید انہیں حکم ہوا۔ کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا مورد عتابِ سلطانی ہوگا۔ یہ فرمادہ فرمانروا تخت سے اٹھا۔ سائل جا بیٹھا۔ حکمرانی کرنے لگا۔

چوتھے روز بادشاہ آیا۔ کہا "کیا قصد ہے"؟ سائل بولا "پہلے تو وہ فقط امتحان تھا۔ اب بادشاہت کا مزہ ملا۔ برائے خدا تاج و تخت مجھے یک لخت بخش دے" بادشاہ نے فرمایا کہ یہ "حکومت آپ کو مبارک ہو" بادشاہت دے کر کچھ نہ ہیہات لیا۔ فقط لڑکوں کا ہاتھ میں ہاتھ بی بی کو ساتھ لیا۔ دل کو سمجھایا کہ اتنے دنوں سلطنت کی۔ حکومت کی۔ چندے فقیری کی کیفیت فاقے کی لذت دیکھئے۔ گو جاہ و حشم مفقود ہے۔ مگر شاہی بہر کیف موجود ہے۔ اس شہر سے کہیں اور چلنا فرض ہے۔ دُنیا جائے دید ہے۔ عنایت خالق سے کیا بعید ہے۔ جو کوئی اور صورت نکلے۔ ایک لڑکا سات برس کا دوسرا نو برس کا تھا۔ غرض کہ وہ حق پرست شہر سے تہی دست نکلا۔ بلکہ تکلف کا لباس بھی نہ لیا۔ جامۂ عُریانی جسم پر چُست کیا اور چل نکلا۔ کل وہ سلطنت و ثروت کروفر، افسر و تاج۔ آج یہ مصیبت۔ اذیت۔ دربدر پیادہ پا سفر۔ محتاج۔ کبھی دو کوس، کبھی چار کوس، بے نقارہ و کوس، ہزار رنج و تعب چلتا۔ اگر کچھ میسر آتا تو روزی ہوتی، نہیں تو روزہ۔ یونہی ہر روز راہ طے کرتا۔ جب یہ نوبت پہنچی۔ چند روز میں ایک شہر ملا۔ مسافر خانہ میں بادشاہ اُترا۔

اتفاقاً ایک سوداگر بھی کسی سمت سے وارد ہوا۔ قافلہ باہر اُترا۔ آپ ہوا کے گھوڑے پر سوار سیر کرتا ہوا جہاں سرا میں وارد ہوا۔ شہزادی گو کہ گردِ راہ صعوبت سفر میں مبتلا تھی۔ لیکن اچھی صورت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ ع (سعدی)

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلارام را

سوداگر کی جو آنکھ پڑی - بیک نگاہ از خود رفتہ ہوا - بادشاہ کے قریب آ کے سلام کیا یہ بیچارے اللہ کے ولی دہ شفق - بادشاہ نے سلام کا جواب دیا اس عرصے میں وہ غدار حیلہ جو نے سوچا - اور بہت افسردہ خاطر ہو کر کہا "اے عزیز میں تاجر ہوں - قافلہ باہر اترا ہے - میری عورت کو درد ہو رہا ہے - دائی کی تلاش میں دیر سے گدائی کر رہا ہوں - ملتی نہیں - تو مرد بزرگ ہے - کج ادائی نہ کر، اس نیک بخت کو للہ میرے ساتھ کر دے - اس کے واسطے سے اس کو رنج سے نجات ملے، ورنہ ایک بندۂ خدا کا مفت خون ہوتا ہے" یہ اللہ کا نام سن کر گھبرائے - بی بی سے کہا "زہے نصیب جو محتاجی میں کسی کی حاجت رفع ہو - کام نکلے - بسم اللہ دیر نہ کر" اس نے دم نہ مارا - سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی -

دروازے سے باہر نکل اس غریب سے کہا "قافلہ دور ہے - مجھے آئے ہوئے عرصہ گذرا ہے آپ گھوڑے پر چڑھ لیں تو جلد پہنچیں" وہ فلک ستائی فریب جانتی تھی - سوار ہوئی -

سوداگر گھوڑے پر بیٹھا، باگ اٹھائی - قافلے کے پاس آ کوچ کا حکم دیا - آپ ایک سمت گھوڑا پھینکا - اُس وقت اِس نیک بخت نے دادِ بیداد مچائی - تڑپی - رو رو بیٹی - چلائی - آہ و زاری اس کی اس بے رحم سنگ دل کی خاطر میں نہ آئی -

بادشاہ پہر بھر منتظر رہا - پھر خیال میں آیا - خود چلئے - دیکھئے وہاں کیا ماجرا ہوا بیٹوں کا ہاتھ پکڑے سرا سے نکلا - ہر چند ڈھونڈا - نشان کے سوا قافلے کا کوئی نشان نہ ملا - دور گرد اڑتی ہوئی دیکھی - جرس کی صدا سنی - نہ پاؤں میں دوڑنے کی طاقت - نہ بی بی کو چھوڑنے کی دل کو تاب - سب طرح عذاب، نہ کوئی یار نہ غمگسار، نہ خدا ترس

نہ فریاد رس۔ بہ حسرت و یاس قافلے کی سمت دیکھ کر یہ کہا۔ مصحفی ؎

تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا

ایسے ہی گر قدم ہیں تمہارے تو ہم رہے

ناچار لڑکوں کو ساتھ لے کر اسی طرف چلا۔ چند گام چل کر راہ بھول گیا۔ ایک ندی ملی۔ مگر نہ کشتی نہ ڈونگی نہ ملّاح۔ راہ سے یہ نا آشنا۔ نہ وہاں سیاح کا گذارا ایک نعرہ مارا۔ اور ہر طرف ماہی بے آب سا واہی تباہی پھرنے لگا۔ ایک لڑکے کو کنارے پر بٹھا۔ چھوٹے کو کاندھے پر اٹھا دریا میں در آیا۔ نصف پانی بصد گرانی طے کیا تھا۔ کنارے کا لڑکا بھیڑیا اٹھا لے چلا۔ وہ چلایا۔ بادشاہ سن کر گھبرایا۔ پھر کر دیکھنے جو لگا۔ کندھے کا لڑکا پانی میں گر پڑا۔ زیادہ مضطرب جو ہوا خود غوطے کھانے لگا۔

لیکن زندگی باقی تھی۔ بہر کیف کنارے پر پہنچا دل میں سمجھا۔ بڑے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا۔ چھوٹا ڈوب مرا۔ نیرنگی فلک سے عالمِ حیرت۔ بی بی کے چھٹنے کی غیرت۔ بیٹوں کے الم سے دل کباب سلطنت کے دینے سے خستہ و خراب۔ اسی پریشانی میں شکر کرتا پھر چلا۔ سہ پہر کو ایک شہر کے قریب پہنچا۔ اور شہر پناہ پر خلقت کی کثرت دیکھی۔ اور اُدھر آیا۔

اس ملک کا یہ دستور تھا۔ کہ جب بادشاہ عازم اقلیم عدم ہوتا۔ ارکان سلطنت، روسائے شہر وہاں آکے باز اڑاتے تھے جس کے سر پر بیٹھ جاتا۔ اُسے بادشاہ بناتے تھے۔ چنانچہ یہ روز وہی تھا۔ باز چھوڑ چکے تھے۔ ابھی کسی کے سر پر نہ بیٹھا تھا۔ اس بادشاہ گدا صورت کا پہنچنا تھا کہ باز اس کے سر پر آ بیٹھا۔ لوگ معمول کے موافق حاضر ہوئے۔ تخت روبرو آیا۔ ہرچند یہ تخت پر بیٹھنے سے باز رہا۔ کہا

"مجھ گم کردہ آشیاں کو سلطنت شایاں نہیں ہے۔ میں نے اس علت سے اپنے مرزبوم شوم کو چھوڑا ہے۔ حکومت سے منہ موڑا ہے" مگر وہ لوگ اس کے سر پر باز کا بیٹھنا عنقا سمجھ باز نہ رہے۔ جو شاہین تھے تاڑ گئے۔ دُور بین پہچان گئے۔ کہ یہ معتبر ہمائے اوجِ سلطنت ہے۔

قصہ مختصر، گرما جگر تخت طاؤس پر بٹھایا۔ نذریں دیں۔ توپ خانے میں شلک ہوئی۔ بڑے تزک حشمت سے آشیانۂ سلطنت۔ کاشانۂ دولت میں داخل کیا۔ تمام قلم و نقد و جنس اشیائے بحری و بری ان کے تحت حکومت قبضۂ تصرف میں آیا۔ سکے پر نام جاری ہوا۔ منادی نے ندا دی۔ دہائی پڑ گئی کہ جو ظلم و جور کا بانی ہو گا۔ وہ گشتہ گردن مارا جائے گا۔ (سوز) :- ؎

پل میں چاہے تو گدا کو وہ کرے تخت نشیں
کچھ اچنبھا نہیں اِس کا کہ خدا قادر ہے

کارخانۂ قدرت عجیب و غریب ہیں۔ نہ اعتمادِ سلطنت نہ قیامِ غربت و عسرت، (مرزا رفیع) :- ؎

عجب نادان ہیں جن کو ہے عُجبِ تاجِ سلطانی
فلک بالِ ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

یہ سلطنت تو کرنے لگا مگر افسردہ خاطر، پژمردہ دل۔ بہ سبب شرم و حیا مفصل حال کسی سے نہ کہتا تھا شب و روز غمگین اور اندوہناک پڑا رہتا تھا۔ جب وہ بلبل ہزار داستاں اپنی فرزندِ شمع دودمان یاد آتے تھے۔ نطقِ سبحانی آہ کو لب پر لاتے تھے۔

اب اس لڑکے کا حال سُنئے، جس کو بھیڑیا اُٹھائے لئے جاتا تھا۔ اُدھر سے کوئی

تیر انداز تیک دست آتا تھا۔ اُس نے چھڑا دیا۔ دوسرا غوطے کھاتا تھا۔ اس کو ماہی گیر نے دام محبت میں اُلجھایا۔ وہ دونوں لاولد تھے۔ اسی شہر کے رہنے والے جہاں ان لڑکوں کا باپ بادشاہ ہوا تھا۔ وہ اپنے اپنے گھر میں لا کر بقدر مقدور لڑکوں کی پرورش کرنے لگے۔ کیا سنگِ تفرقہ فلک نے پھینکا۔ کہ ایک دوسرے سے جدا ہو گیا۔ چند عرصہ میں بیٹوں کی مفارقت نے بادشاہ کو بے چین کیا۔ وزیر سے فرمایا "دو لڑکے قوم شریف سے ہماری صحبت کے قابل لا" وزیر نے تمام شہر کے لڑکے طلب کیے۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات وہ دونوں بھی آئے۔ سبحان اللہ۔ جامع المتفرقین بھی اسی کا نام ہے۔ بچھڑے ملانا۔ اُس کے روبرو کتنا کام ہے۔ وہی وزیر کو پسند آئے، رُوبرو لایا۔ بہ سبب طولِ زمانِ مفارقت اور تکلیف عسرت نقشے بدل گئے تھے۔ وضع قطع اور ہو گئی تھی۔ نہ بادشاہ نے پہچانا۔ نہ تقاضائے سن سے لڑکوں نے باپ کو جانا۔ اور نہ یہ سمجھ آئی کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ یہ بھی قدرت نمائی ہے۔ بہم ہوئے۔ مگر جدا رہے لیکن بادشاہ بہ محبت تمام مصروف عنایت علی الدوام تھا۔ تھوڑے دن میں معتمد و مقرب ہوئے۔

اور وہ سوداگر جو فروش گندم نما دغا کا پتلا یہاں کے پہلے بادشاہ سے رسائی علیے سے شناسائی رکھتا تھا۔ اس نظر سے وہ بھی اُس عورت ناراض کو لے کر وہاں وارد ہوا۔ خبرِ مرگ بادشاہ سن کر ملول ہوا۔ کہ مطلب نہ حصول ہوا۔ لوگوں نے کہا۔ بادشاہ تازہ وارد اس سے زیادہ خلیق و غریب پرور ہے۔ بوساطتِ وزیر اعظم تحفہ تحائف حضور میں نذر کر۔ شرف اندوز ملازمت ہوا۔ اس کو بھی بادشاہ نے نہ پہچانا۔ نہ سوداگر نے حریف جانا۔ مگر بادشاہ اس کو ذی اعتبار بستیاح دیار دیار سمجھ۔ بیشتر اطراف و جوانب کا مذکور سنتا۔

ایک دن قریب شام حضور میں حاضر تھا۔ بادشاہ نے فرمایا "آج کی شب گھر نہ جانا کچھ پوچھنا ہے" وہ بیٹھا تو مکدر و پریشان۔ بادشاہ نے تردد کا سبب پوچھا۔ بہ باعث عنایت فی الجملہ گستاخ ہو چلا تھا۔ دست بستہ عرض کی "خانہ زاد کے پاس ایک عورت ناراض ہے اس کو فدوی سے اغماض ہے۔ اس کی نگہبانی بذات خود کرتا ہوں ایسا نہ ہو بگل کے راز نہاں فاش کرے۔ حمایتی تلاش کرے" حکم ہوا۔ یہ مقدمہ آج ہمارے ذمہ ہے۔ وہی لڑکے بسکہ معتمد تھے۔ خاص دستہ ان کے ہمراہ کر پاسبانی کی تاکید کی۔ لڑکے آداب بجالا کے سوداگر کے مکان پر گئے۔ باغ میں خیمہ برپا تھا۔ در خیمہ پر کرسی بچھا دونوں بیٹھے۔ لوگ گرد کھڑے ہو گئے۔

جب آدھی رات گزری۔ ایک کو نیند آنے لگی۔ دوسرے نے کہا "سونا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو۔ کوئی فتنہ خوابیدہ جاگے۔ خیمے سے کوئی چونک بھاگے" وہ بولا "تو ایسا افسانہ کہو۔ جو نیند اُچٹنے کا بہانہ ہو" اُس نے کہا "خیر آج ہم اپنی سرگزشت کہتے ہیں۔ اگر غور سے سنو گے۔ نیند کیا کئی روز تک بھوک پیاس پاس نہ آئیگی۔ اے عزیز باتمیز میں بادشاہ یمن کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ للہ سلطنت سائل کو دے مجھے اور ایک میرا چھوٹا بھائی کہ وہ تم سے بہت مشابہ تھا اسکو اور ہماری ماں کو ہمراہ لے کر غریب الوطن ہوا تھا۔ راہ میں ایک سوداگر فریب سے شہزادی کو لے گیا۔ ہم دونوں بھائی ساتھ رہے آگے چل کر دریا ملا۔ ناؤ بیڑا کچھ نہ تھا۔ بادشاہ مجھ کو کنارے پر بٹھا۔ چھوٹے کو کندھے پر اُٹھا پار چلا۔ مجھے بھیڑیے نے پکڑا۔ میرے چلانے سے بادشاہ بدحواس ہوا۔ بھائی دوش سے آغوش دریا میں کھسک پڑا۔ خود غوطے کھانے لگا۔ پھر نہیں معلوم کیا ہوا۔ مجھے ایک تیرانداز نے دہن گرگ سے چھڑایا اب فلک اس بادشاہ کے پاس لایا"

وہ رو کر لپٹ گیا۔ کہا "بھائی دریا میں ہم گرے تھے۔ مچھلی والوں کے باعث ترے تھے۔" پھر دونوں بغلگیر ہو، ایسے چلائے۔ کہ وہ عورت چونک پڑی، پردے کے پاس آکر حال پوچھنے لگی۔ انھوں نے ماجرائے گذشتہ بیان کیا۔ وہ پردہ اُلٹ کر لڑکوں سے لپٹ گئی۔ کہا "ہم اب تک سوداگر کی قید میں ہیں۔"

اُسی دم یہ خبر بادشاہ کو پہنچی۔ سواری بھیجی۔ طلب کیا۔ اس وقت سب نے پہچانا، سوداگر کو قید کیا۔ صبح دم جب جلادِ سپہرِ بے مہر شمشیرِ شعاع کھینچ کر ہنگامہ پردازِ عالم ہوا۔ سوداگر کو کاروانِ عدم کا ہم سفر کر بارِ ہستی سے سبک دوش کیا۔ یمن میں اخبار نویسوں نے حال لکھا۔ وہاں ہڑبونگ مچا تھا۔ وہ ظالم ستم شعار بدرجہ ظلم پیشہ جفا کار نکلا۔ رعیت نالاں۔ ارکانِ سلطنت ہراساں رہتے تھے۔ ہزاروں رنج رات دن سہتے تھے جب یہ خبر وہاں پہنچی۔ وزیر نے زہر دے کر اُسے مارا۔ تلخ کامی سے نجات پائی، اور عرضداشت اپنی بادشاہ کو مع تمنائے قدم بوسی تمام شہر کی تحریر کی۔ بادشاہ کے بھی محبت وطن دل میں جوش زن ہوئی۔ سفر کی تیاری ہونے لگی ؂

حُبِّ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر　　خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یُوسف کہ بہ مصر بادشاہی مے کرد　　مے گفت گدا بودنِ کنعاں خوشتر

القصہ یمن میں آیا۔ دونوں سلطنتیں قبضے میں رہیں۔

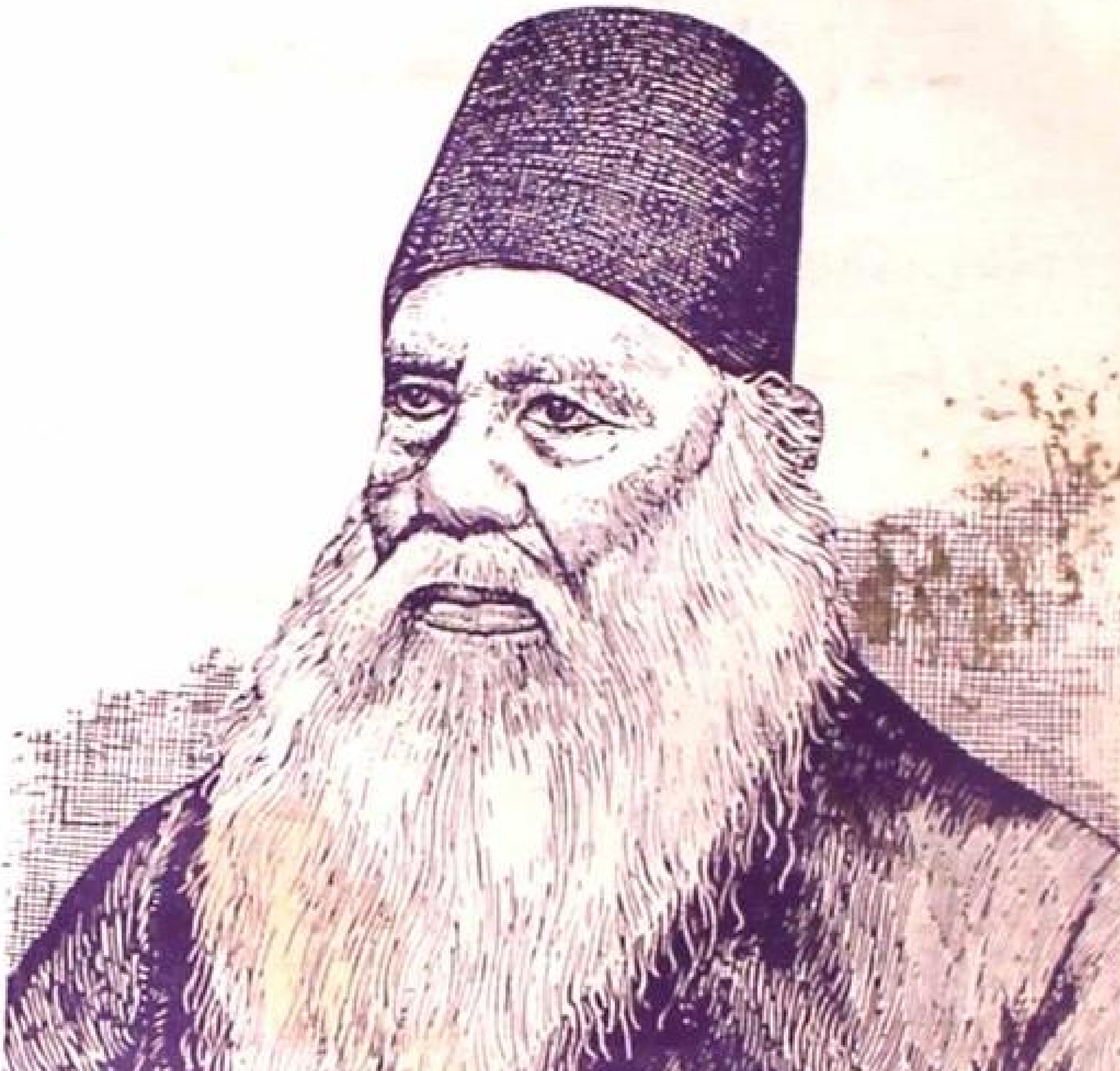
(رجب علی بیگ سرور)

سر سیّد احمد خاں

آپ ۱۸۱۷ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر متقی تھا۔ اُن کے بزرگ ہرات سے ہندوستان میں غالباً شاہ جہاں کے عہد میں آئے تھے۔ سیّد احمد خاں کی والدہ خواجہ میر دردؔ کے خاندان کی ایک دانشمند اور نیک دل خاتون تھیں۔ سر سید احمد خاں نے اسکول میں زیادہ تعلیم نہیں پائی لیکن نجی مطالعہ اور اس زمانہ کے باکمال آدمیوں کی صحبت نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ چونکہ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہی صرف لال قلعہ کی چار دیواری میں گھر کر رہ گئی تھی، اس لئے سیّد احمد خاں نے محکمۂ عدالت انگریزی کا رُخ کیا اور سررشتہ داری سے ترقی کرتے کرتے صدر الصدور کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے۔ آخری تاجدار دلّی نے انہیں ان کے آبائی خطاب نواب جواد الدولہ عارف جنگ سے سرفراز فرمایا۔ سرکار انگریزی نے کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغہ عطا کیا۔ اڈنبرا یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری ملی۔ چنانچہ آج ہم بڑے فخر سے انہیں "نواب جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خاں دہلوی" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

سید صاحب بیک وقت قانون داں، مصنّف، مدبّر، مصلحِ قوم اور ماہرِ تعلیم تھے، پنشن پانے کے بعد انہوں نے اپنی بقیہ زندگی قومی خدمت کے لئے وقف کر دی اور ۱۸۹۸ء میں رحلت فرمائی۔

یوں تو سر سید نے ہماری زندگی کے بہت سے تاریک پہلوؤں کو روشن کیا



سر سید احمد خاں

ولادت : ۱۸۱۷ء — وفات : ۱۸۹۸ء

جنہوں نے پاک و ہند کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے ذریعے
زمانے کے نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا اور جن کی
بدولت اردو علمی زبان بننے کے لائق ہوئی۔

لیکن اخباری اُردو کا موجودہ فروغ انہی کی جنبشِ قلم کا نتیجہ ہے۔

نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی جیسے انشا پرداز آپ ہی کے فیضِ صحبت سے متاثر ہو کر میدانِ عمل میں آئے۔ ان کی مشہور کتابیں آثار الصنادید، اسباب بغاوتِ ہند، ابطالِ غلامی، خطباتِ احمدیہ اور تفسیر القرآن وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے اکثر مضامین بھی جن میں تعلیمی اصلاح اور درستیٔ اخلاق پر زور دیا گیا ہے، انہی کے قلم کے ہیں۔ اور آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں۔

سرسید کا طرزِ تحریر نہایت دل آویز، شستہ اور عبارت آرائی سے پاک ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں اُسے حد درجہ صاف و سادہ الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ اور پڑھنے والا مزے لے لے کر اُسے پڑھتا ہے اور کہیں کوئی اُلجھن محسوس نہیں کرتا لیکن مرحوم کا سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ محمڈن کالج علیگڑھ کا قیام تھا جو علمائے وقت کی سخت مخالفت کے باوجود مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور علوم جدیدہ سے واقفیت پیدا کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا یہی کالج ترقی کرتے کرتے بالآخر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بنا جہاں ان افراد کی اکثریت نے تعلیم پائی جو آج کل قوم کے رہنما اور آزادی کے علم بردار ہیں۔

تعصّب

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصّب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصب گو

اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات ظاہر ہے کہ عدل وانصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائلِ انسانی سے ہے اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا کیونکہ اس کا تعصب اسکے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

انسان قواعدِ قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی جو دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے مگر متعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز ان چند لوگوں کے جو اُس کے ہم رائے ہیں مائل نہیں ہوتا۔

عقل اور قدرت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ منفعت اور زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں ان کو انسان اختیار کرے مگر متعصب ان سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

ہنر، فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے مگر متعصب اپنی بد خصلت سے ہر ایک ہنر، فن اور علم کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

وہ ان عام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے، اس کی عقل اور دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے اور جو کچھ اس میں سمائی ہوئی ہے اس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہے کہ اس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے اُس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث تمام باتوں میں، کیا اخلاق اور علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب اور شائستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجے سے نہایت پست درجۂ ذلت و خواری کو پہنچ گئی ہیں جنھوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں، اور ادنیٰ درجے سے ترقی کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پہنچ گئیں۔

مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بد خصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کر دکھانے سے محروم اور ذلت و خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اسی لیے میری خواہش ہے کہ وہ اس بد خصلت سے نکلیں اور علم و فضل اور ہنر و کمال کے اعلیٰ درجہ کی عزت تک پہنچیں۔

غرضکہ تعصب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دنیادی باتوں میں، نہایت بُرا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ مغرور اور متکبر ہو جانا اور اپنے ہم جنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہے۔

اس کے اصول کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں سے سوائے چند کے کنارہ گزیں ہو مگر ایسا کر نہیں سکتا اور بہ مجبوری ہر ایک سے ملتا ہے اور اوپر کے دل سے ان کا ادب اور اپنی جھوٹی نیازمندی بھی ظاہر کرتا ہے اور ایسا کرنے سے ایک اور بدخصلت، نفاق، کذب، دغابازی، فریب، مکاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہے۔

دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اُٹھایا ہے مگر متعصب شخص اِن نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے۔

علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی، ہنر و فن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی، دُنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے، عجائباتِ قدرت دیکھنے سے محروم رہتا ہے، حصولِ معاش اور دنیاوی عزت و تموّل مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دُنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل و خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔

اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں؟ بُلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے، بیا کیا بُن رہا ہے اور مکھی کیا چن رہی ہے؟

وہ بجز گوڑے پر کی گھاس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور
پھول کیوں کھلا ہے، نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے؟

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر کمال انسان میں نہیں آتا۔ متعصب انسان میں تربیت و شائستگی، تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا اور جب کہ وہ مذہبی غلط نمائیکی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی ستم قاتل ہوتا ہے کیونکہ صحیح مذہب کو تعصب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسان کے خراب و برباد کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا داؤں تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتے کو روشنی کا فرشتہ کر دکھلانا ہے۔ بس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بڑا منصف ہے اور سچا، سچائی کا پسند کرنے والا ہے، وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے، وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے۔ پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بُری خصلت ہے چھوڑنا چاہیے۔ تمام بنی نوعِ انسان ہمارے بھائی ہیں۔ ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے، پس اسی کی ہم کو پیروی چاہیے۔

(سر سید احمد خاں)

مولانا محمد حسین آزاد

آپ سنہ ۱۸۳۴ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ آزاد کے والد ملا محمد باقر مجتہد تھے۔ ان کی والدہ ایرانی تھیں۔ فارسی آزاد کی مادری زبان تھی۔ سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں ملا صاحب ہی نے اردو اخبار جاری کیا۔ ملا باقر اور استاد ذوق میں بڑی دوستی تھی۔ آزاد کی شاعری نے استاد ذوق ہی کے ظلِ عاطفت میں نشو ونما پائی۔ غدر کے ہنگامہ میں ملا باقر مارے گئے اور آزاد کو دلی چھوڑنا پڑی عرصہ تک ادھر اُدھر مارے مارے پھرے۔ آخر لاہور پہنچے۔ وہاں آپ اخبار "اتالیق" کے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر ہوئے۔ جب یہ اخبار بند ہو گیا تو "پنجاب میگزین" جاری ہوا۔ آزاد اس کے بھی سب اڈیٹر ہوئے۔ اس سے علیحدہ ہونے پر گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اسی دوران میں سرکار انگریزی کے ایما سے کابل و بدخشاں کا سفر کیا۔ چند سال بعد ایران جانا پڑا۔ یہاں ان کی مادری زبان نے جلا پائی۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ ادبی خدمات کے صلہ میں شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔

آزاد کو اللہ نے بڑی ہونہار بیٹی دی تھی۔ جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ انہی دنوں داغ مفارقت دے گئی۔ اس صدمہ سے آزاد کا دماغ بگڑ گیا۔ مگر وہ اس جنون کی حالت میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ آخر جنوری سنہ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔



مولانا محمد حسین آزاد

"آقائے اردو"

آزاد اُردو زبان کے بہت بڑے ادیب، گراں پایہ نثّار و نقاد تھے۔ اُردو پر ان کے بے حد احسانات ہیں۔ آزاد اپنی تحریر کے مُوجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ ان کا قلم عربی، فارسی کے نامانوس الفاظ، پیچیدہ ترکیبوں اور لفظی صنائع و بدائع کو مُنہ نہیں لگاتا۔ دہلی کی ٹکسالی زبان میں لطیف استعارے اور تشبیہیں ظرافت کی چاشنی کے ساتھ ایسی بے تکلفی سے لکھ جاتے ہیں کہ شاید و باید۔ آزاد کی دوسری اُردو کتابیں آبِ حیات، دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال، قصصِ ہند اور مجموعہ نظم آزاد ہیں۔ آزاد کا شاہکار "آبِ حیات" ہے۔ یہ شعرائے اُردو کا تذکرہ بھی ہے۔ اور واقعات و حکایات کا ایک بے بہا خزانہ بھی ہے اس کی بے مثل طرزِ عبارت کی نقل کی کوشش بہتوں نے کی لیکن کوئی کامیاب نہ ہو سکا۔

اورنگ زیب کی فوجی تیاری

اکبر کے آئین اور جہانگیر کی خوش مستیوں نے عہدِ شاہ جہاں کے امن و امان میں پرورش پاکر عجیب و غریب رنگ پیدا کئے تھے یعنی سلطنت کی شان و شوکت کے ساتھ فوج کا بھی ڈھنگ بدل گیا تھا۔ چنانچہ جب دیکھنے والے انہیں دیکھ کر تیموری اور بابری سواروں کا اور ان کی یگبٹٹ یلغاروں کا خیال کرتے تھے تو تعجب آتا تھا۔ لشکر کے ادنیٰ سے ادنیٰ رسالدار کا یہ عالم تھا۔ کہ اُس کے ساتھ رسالہ ایک دولھا کی برات معلوم ہوتی تھی۔ خیال کرنا چاہیئے کہ ایک ایک شہزادے کا اور خود بادشاہ کی سواری کا کیا عالم ہوگا۔ غرض لشکرِ شاہی نے نشان چڑھایا اور دکن کو روانہ ہوا۔ سب سے پہلے ایک ہاتھی پر عَلَم اژدہا پیکر، پیچھے اس کے ہاتھیوں پر ہندوستان کا ماہی مراتب اپنی ولایت سے

طوغ وعلم برچھی اور فولادی نقارے اور دمامے، بعد ان کے ہزاروں ہاتھی ہودج عماری سے سجے، سونڈوں میں فولادی زنجیریں لئے۔ گلے میں ہیکلیں، پیشانیاں شام شفق کی طرح رنگین۔ اُس پر سنہری رو پہلی ڈھالیں، زربفت کی جھولیں پاؤں تک لٹکتی، کسی پر ہودج، کسی پر عماری، ریشمین اور کلابتونی رسّوں سے کسی گردنوں پر مہاوت جن کے گلے میں زربفت کی کُرتیاں سر پر جوڑے دار پگڑیاں، کمر میں کٹار، ایک ہاتھ میں گجباگ، ایک میں آنکس، جھومتے جھامتے چلے جاتے تھے۔ آگے پیچھے چرکٹے، سانٹے مار بھالے دار، برچھیت، باندار، فتیلے سُلگاتے بھاگے چلے جاتے تھے۔ پھر ہزاری سواروں کے پرے سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے بہادر نوجوان تُرک بچے، افغان، حبشی، راجپوت دو دو تلواریں باندھے، فولادی خود سروں پر دھرے، کمر میں قرولی اور کٹار، پشت پر گینڈے کی ڈھال، چار آئینے سجے، کہنیوں تک دستانے چڑھے، ہاتھ میں سات گز کا برچھا۔ نگاہوں سے خون ٹپکتا۔ موچھوں کو تاؤ دیتے، گھوڑے اُڑاتے چلے جاتے تھے۔ پھر ہزاروں سانڈنیاں خوش رفتار کہ جن کے سو سو کوس کے دم۔ اُن پر بانکے راجپوت لال پگڑیاں باندھے، زرد انگرکھے پہنے۔ آبی بانات کے پاجامے چڑھائے ہتھیار لگائے۔ مہاریں اُٹھائے جب یہ گزر گئے تو سواری کے خاص خاصے نظر آئے۔ عربی، ترکی، عراقی، یمنی، کاٹھیاواڑ کے دکنی۔ چاندی سونے کے بھاری بھاری ساز کسی پر جڑاؤ زین دھرا، کسی پر چارجامہ کسا، قجریاں اور پاکھریں پٹھوں پر پڑی، جن میں تاقم وسمور کی جھالر، کلابتوں کے پھندے، گلے میں سراگائے کی چوڑیاں لٹکیں، سر پر کلغیاں طلائی اور نقرئی، ریشمی باگ ڈوریں، سائیسوں کے ہاتھوں میں اٹھیل کرتے اور چوکڑیاں بھرتے چلے جاتے تھے۔ ان کے بعد عربی، رومی، تاتاری، فرنگی، ہندی باجے

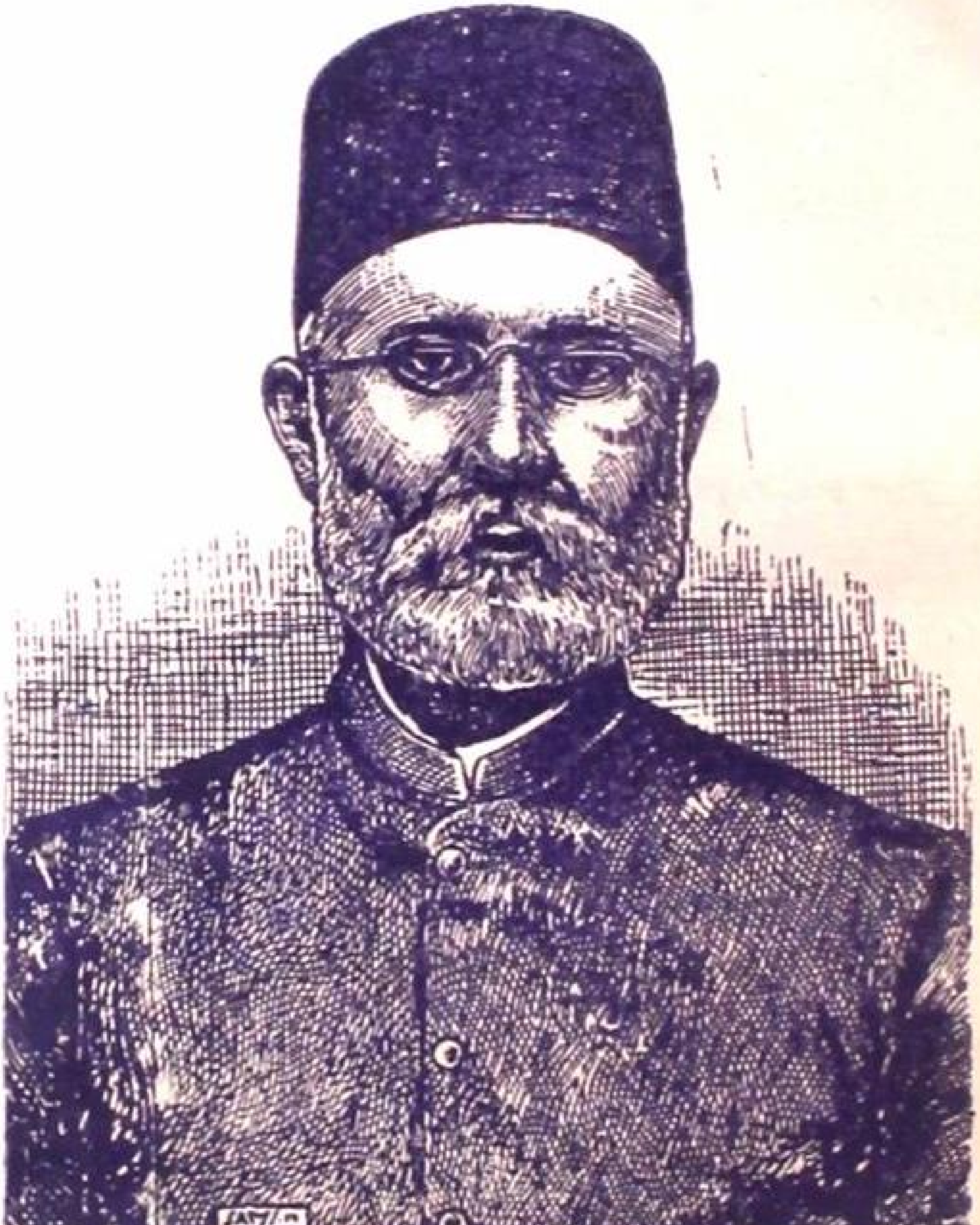
نقیبوں اور چوبداروں کے آوازے، دمامے کی چوٹ کے ساتھ کڑکیتوں کے کڑکوں کا وہ خیال بندھا ہوا کہ بُزدلوں کے دلوں میں لہو جوش مارنے لگے۔ ان کے بعد احدیوں اور خواصوں کا انبوہ کندھوں پر بندوقیں جن پر بانات کے غلاف۔ پھر خاص برداروں کا غول۔ سروں پر کشمیری شالیں بندھی۔ کم خواب کے انگرکھے، زربفت کی نیم آستین پہنے، گجراتی مشروع گھٹنے چڑھائے، اصفہانی تلواریں سونتے۔ مرصع قبضے ہاتھ میں، سنہری رُوپہلی میانِ کمر میں۔ ان کے بعد سقّوں کا غول آیا کہ چھڑکاؤ سے روئے زمین کو تر و تازہ کر دیا۔ غلام اور خواجہ سرا انگیٹھیاں اور عود سوز لئے خوشبوؤں سے دماغ معطّر کرتے چلے گئے۔ پھر ارکانِ دربار کے جھمگٹ۔ بیچ میں شاہ خورشید کلاہ سفید داڑھی بڑھاپے کا نور منہ پر، ہوادار میں سوار، ساتھ ایک خاصے کا گھوڑا، پیچھے ایک سونے کی عماری ہاتھی پر دھری، جریب کا پیمانہ اور کوس کا پیا پڑتا چلا جاتا تھا۔ سواری سے کوس بھر پیچھے سینکڑوں ہاتھی مست جنگی دیوزاد کی صورت مستکوں پر فولادی ڈھالیں ایک کالی گھٹا چلی آتی تھی کہ جس سے بجائے پانی کے مستی ٹپکتی تھی۔ پیچھے چیتوں کے چھکڑے آنکھوں پر زردوزی دیدہ بند، کمر میں کلابتونی اور ریشمی حلقے پڑے ساتھ ہی شکاری کتے۔ تازی، ولائتی، بودار، بولڈوگ کہ شیر کا سامنا کریں اور پلنگ سے منہ نہ پھیریں۔ پیچھے کوسوں تک شاہزادوں اور ارکانِ دولت کے لشکر، راجوں مہاراجوں کی فوجیں، پیادوں کے غول اور سواروں کے رسالے رنگا رنگ کے نشان۔ جدا جدا پھریرے اُڑاتے چلے آتے تھے، پھیرو بنگاہ کا تانتا لگا تھا کہ جس کا صبح سے شام تک خاتمہ نہ تھا۔

(محمد حسین آزاد)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

تذکرہ :- خواجہ صاحب ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابھی نو ہی برس کے تھے کہ آپ کے والد مولوی ایزد بخش کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی اور بہن نے ان کی تعلیم و تربیت کا بار اُٹھایا۔ سترہ سال کی عمر میں خواجہ صاحب کی شادی کردی گئی۔ بیوی کا میکہ خوش حال تھا، مگر آپ تکمیل علم کے شوق میں چپکے سے دلّی چلے آئے اور یہاں ڈیڑھ سال تک عربی فارسی اور علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وطن واپس آئے۔ یہاں بھی کتب بینی میں مشغول رہے۔ کچھ عرصہ بعد حصار میں کلکٹری میں ایک چھوٹی سی ملازمت کرلی ۱۸۵۷ء کے غدر نے پھر پانی پت پہنچا دیا۔ یہاں مختلف علماء سے فلسفہ، حدیث اور تفسیر کے درس لیتے رہے۔ چار سال بعد دوبارہ دلّی پہنچے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے لڑکوں کے اتالیق مقرر ہوگئے۔ نواب صاحب کے فیض صحبت نے حالیؔ کو حالیؔ ہی نہیں بنایا بلکہ غالبؔ کی شاگردی کا شرف بھی بخشا اور زندۂ جاوید کردیا۔ اُنھوں نے مولانا آزاد کے ساتھ نئے انداز کی نظمیں لکھیں۔

چار سال بعد دلّی آئے اور اینگلو عربک اسکول میں جو اب کالج بن گیا ہے، ٹیچر ہوگئے۔ یہیں سرسید سے ملاقات ہوئی اور ان کی فرمائش پر مسدس مدوجزر اسلام لکھا۔ نواب شیفتہ کے انتقال پر مولانا کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک جگہ مل گئی، یہاں انگریزی خیالات کی سادگی اور واقعیت



مولانا الطاف حسین حالی
ادب کے نئے دور کا پیغام بر

سے متاثر ہوئے۔ حیدرآباد سے ادبی وظیفہ مقرر ہو جانے پر مولانا پانی پت چلے آئے اور تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں اعتراف قابلیت کے طور پر حکومت نے شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔

تبصرہ:۔ مولانا جیسے بلند پایہ شاعر ہیں، ویسے ہی نہایت اعلیٰ درجہ کے نثار بھی ہیں۔ آپ کی عبارت بہت زوردار اور درد سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اسلوب بیان سے زیادہ ادائے مطلب کا خیال رکھتے ہیں۔ لفاظی اور عبارت آرائی ان کا شیوہ نہیں ان کی سلجھی ہوئی اور صاف ستھری اُردو، موجودہ نسلوں کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ حالی اُردو زبان میں سوانح نگاری کے بانی ہیں۔ ان کی حیات سعدی، حیاتِ جاوید اور یادگار غالب مقبول عام کتابیں ہیں۔ مقدمۂ شعر و شاعری اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہے۔

مولانا اُردو میں نیچرل شاعری کے حامی تھے۔ انکے شعر سادگی اور حقیقت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حب الوطن، بیوہ کی مناجات، شکوۂ ہند، نشاطِ امید وغیرہ بھی اگرچہ اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں لیکن مسدس کو جو بقائے دوام حاصل ہوا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

سرسیّد کی طرزِ تحریر

نہایت صحیح اور سچا مقولہ ہے کہ "اذا اراد اللہ شیئاً ھیأ اسبابہ"[1] چونکہ سرسید سے قوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام ظہور میں آنا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے ان کی ذات

---

[1] جب خدا کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے اسباب پہلے تیار کر دیتا ہے۔

میں وہ تمام خاصیتیں جمع کردی تھیں جو ایک رفارمر میں ہونی ضرور ہیں، انہیں خاصیتوں میں سے ایک یہ بھی کہ وہ ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنّع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے اور گرامر کی پابندی سے فطرتاً آزاد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے جو اول اول دلّی میں اپنے گرد شعرا کا جمگھٹا دیکھ کران کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا کچھ بہت دن نہ گذرے کہ وہ ان تکلفات لایعنی سے جو شاعری کے لئے لازم ہیں اور حقائق نگاری میں مخل ہوتے ہیں ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو گئے۔ انہوں نے "سیرتِ فریدیہ" میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے کہ ان کے نانا نے جبکہ وہ بوستاں پڑھتے تھے اُن کا سبق سُنا، سبق میں وہ شعر بھی تھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔ ع:-

"طمع را سہ حرف است ہر سہ تہی"

اُنہوں نے اس کا ترجمہ کیا کہ "طمع کے تین حرف، تینوں خالی" نانا نے تین دفع ٹوکا اور بہت خفا ہوئے مگر یہ وہی معنی کہے گئے۔ چونکہ محاورے کے موافق ترجمہ بھی فصیح تھا اس لئے گرامر کا مطلق خیال نہ آیا۔ جو حال ان کا اس بچپن کے زمانہ میں تھا وہی آخر دم تک باقی رہا، وہ تقریر یا تحریر کی رو میں گرامر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں، بالکل آزاد تھے۔ وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان دلّی کی بول چال میں محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی ان کی زبان اور وہی اُن کی بول چال تھی۔ غالباً اُنہوں نے کسی لفظ کے استعمال کرتے وقت یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ یہ لفظ اہلِ زبان بولتے ہیں یا نہیں؟ اور کسی فقرے کو لکھ کر پھر یہ نہ دیکھا ہوگا کہ قواعد کی رو سے اس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں؟۔

یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ایک سچے رفارمر کے کلام میں ایسی ہی

ضروری ہے جیسی سچائی اور راست بازی - وہ مثل شاعروں اور انشا پردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسائیوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے، ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے منہ سے نکل جاتے ہیں - وہ واقعات پر تشبیہ و استعارے کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ ان کی ننگی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے - وہ الفاظ و قواعد کو محکوم رکھتا ہے -

الغرض سرسید نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنع کو کبھی دخل نہیں دیا جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی غدر کے زمانے تک جو تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے اپنے اسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائیل میں ہر قسم کی تحریریں، کیا کتابیں، کیا مضامین اور کیا مقدمات کے فیصلے اور تجویزیں، برابر لکھتے رہے اس بیس سال کی مشق و مہارت نے جو ایک انداز پر متصل جاری رہی، ضرور ہے کہ ان کے قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ مضمون کے سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہوگی کیونکہ نیچرل قویٰ سے جب ان کے مقتضا کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے تو ان سے اکثر فوق العادہ کرشمے ظہور میں آتے ہیں - مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب کہ اس سیدھی سادی تحریر کے اصلی جوہر کھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے شعلے بلند ہونے والے تھے - غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر یا تقریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ

اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اسی ایک مقصد کے لئے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی کو، کلام کی بنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر، کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈھ ڈھونڈ کر اہل زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ہے، اسی طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر، مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں ہے

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

بے شک کلام کے مؤثر ہونے کے لئے اس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہو، جب تک کہ متکلم کا دل سچائی اور آزادی سے بھرا ہوا نہ ہو کبھی مؤثر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح تلوار کی کاٹ درحقیقت اس کی باڑ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرتبی ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح کلام کی تاثیر اس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلم کی سچائی اور اس کی نڈر اور بے لاگ زبان میں ہے۔ وہی الفاظ جو ایک سچے اور دل سوز ناصح کی زبان سے نکل کر لوگوں کے دلوں پر تیر و سناں کا کام کرتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ ایک نمائشی واعظ کی زبان پر ان میں کچھ بھی اثر باقی رہے۔ سچے ناصح کے لعن وطعن میں جو اثر ہوتا ہے وہ جھوٹے واعظ کی بشارتوں میں نہیں ہوتا۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت ان کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا۔ باوجودیکہ مسلمان صدہا سال سے نہ صرف مذہب میں بلکہ علوم و فنون میں، لٹریچر میں، رسم و رواج میں، اخلاق و عادات میں،

طریقِ معاشرت میں، غرض کہ ہر چیز میں اگلوں کی لکیر پر فقیر چلے آتے تھے اور کوئی ایسی بات جس سے، ان کے کان آشنا نہ ہوئے ہوں ہرگز سننی نہ چاہتے تھے مگر سچ میں وہ کرشمہ ہے کہ تاریکی میں بھی وہ چمکے بغیر نہیں رہتا۔ جو شخص سب سے پہلے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر اور سوسائٹی کی رکاوٹوں کو برطرف کر کے قوم کی اصلی بھلائی کے خیالات صاف صاف ظاہر کرتا ہے، گو کہ وہ قوم کے مذاق اور الف وعادات کے کیسے ہی برخلاف ہوں۔ ان میں عجیب قسم کی کشش ہوتی ہے کہ ان کے سننے کے لیے موافق اور کیا مخالف سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور دونوں فریق مختلف طور پر ان سے متاثر ہوتے ہیں؟ بھلا ان کو حق سمجھ کر بے چون و چرا قبول کرتا ہے اور دوسرا ان میں مقبولیت کے آثار نمایاں دیکھ کر خائف ہوتا ہے کہ مبادا یہ خیالات تمام قوم میں شائع ہو جائیں۔ سرسید کی تحریر میں یہی چیز تھی جس نے سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جادو کا سا اثر پیدا کر دیا تھا اور تمام قوم میں ہل چل ڈال دی تھی۔

مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سرسید کی تحریر جو بظاہر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی، درحقیقت اس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب عمدہ اور پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کئے جاتے ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اتر جاتے ہیں تو خیالات کی خوبی ناظرین کو الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی بلکہ محاسنِ لفظی خیالات کے شکوہ میں دب جاتے ہیں۔ اس کے سوا جب مصنف کی ہمت محض عمدہ خیالات کے پھیلانے پر مصروف ہوتی ہے تو اس کے بیان میں محاسن لفظی کی اسی قدر گنجائش ہوتی ہے

جس قدر کہ ہر مقام کا مقتضا ہوتا ہے اور اس لئے وہ عبارت میں اس قدر گھل مل جاتے ہیں کہ جب تک بنظر غور نہ دیکھا جائے عام بیان اس سے سادہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تحریر میں لفظی خوبیاں ایسی اُجاگر نہیں معلوم ہوتیں جیسی دیگر مصنفوں کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں، ورنہ صنائع لفظی کے سوا اس میں تمام محاسن لفظی و معنوی موجود ہیں، تشبیہیں بھی ہیں، استعارے بھی ہیں، کنائے بھی ہیں، تمثیلیں برجستہ اور تلمیحیں نہایت پُرلطف ہیں، بذلے اور لطیفے حد سے زیادہ دلکش اور دل فریب ہیں، کہاوتیں اور اشعار برمحل جا بجا نظر آتے ہیں، مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اس میں ایسا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے گویا بے قصد و بے ارادہ مصنف کے قلم سے ٹپکی ہے۔

مگر جو چیز کہ سرسید اور دیگر مصنفوں اور مضمون نگاروں میں مابہ الامتیاز ہے وہ قدرتِ بیان ہے جس کے ثبوت کے لئے خود ان کی مختلف تحریروں کو دیکھ لینا کافی ہے۔ مصنف کی قدرت بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے، ایک یہ کہ وہ ہر ایک مضمون کو اسی پیرایہ میں بیان کر سکے جو اس مضمون کی حالت کے مناسب ہے کیونکہ ہر قسم کے کلام کا پیرایۂ بیان جدا ہوتا ہے۔ جس ڈھنگ پر ناول لکھا جاتا ہے اس ڈھنگ پر تاریخ یا بایوگرافی نہیں لکھی جاتی۔ جہاں متانت اور سنجیدگی کا موقع ہوتا ہے وہاں ظرافت نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ہیں، مگر کسی سررشتہ کی سالانہ رپورٹ یا کسی مقدمے کے فیصلے یا کسی پبلک جلسے کی روداد میں اس سے زیادہ کوئی چیز بدنما نہیں ہوتی۔ اسی لئے کہا گیا ہے "ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد"، مگر جہاں تک دیکھا جاتا ہے ہر مصنف پر اس کی

طبیعت کے میلان کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایۂ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا اور یا جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے اس کو اسی خاص رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ مثلاً بعضوں کا قلم حسن و عشق کے میدان میں خوب دوڑتا ہے، بس یا تو ایسے مضمون پر قلم ہی نہیں اُٹھاتے جس میں حسن و عشق کی چاشنی نہ ہو اور یا جو مضمون لکھتے ہیں اس کو اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح بعض کی طبیعت پر استعارہ اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ سیدھے رستے سے بھی چکر کاٹے بغیر نہیں گذرتے، بعضے ہر ایک مضمون میں ظرافت کی چاشنی دینی چاہتے ہیں، اگرچہ نفس مضمون اس سے ابا کرتا ہو غرض کہ جس مضمون نگار یا مصنّف کو دیکھئے اس پر کوئی نہ کوئی بھوت سوار ہوتا ہے۔

مگر سرسید کی تحریروں کو ہم اس عام قاعدے سے مستثنیٰ پاتے ہیں۔ ان کی ہر قسم کی بے شمار تحریریں کیا تاریخی، کیا علمی، کیا مذہبی، کیا اخلاقی، کیا سوشل، کیا پولٹیکل، کیا ادبی اور کیا ٹیکنیکل، علی گڑھ گزٹ، تہذیب الاخلاق، تصانیف احمدیہ، سالانہ رپورٹوں، عدالت کے فیصلوں، جلسے کی روئدادوں اور پرائیویٹ خطوں وغیرہ میں موجود ہیں؛ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایۂ بیان پایا جاتا ہے جو اس کے لئے موزوں اور مناسب ہے حالانکہ مصنّف کو خود خبر نہیں کہ کس مضمون کے لئے کون سا پیرایۂ بیان موزوں ہے۔ مگر تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد و ارادے کے قلم کو اس راہ پر ڈال دیتی ہے جس پر اُس کو چلنا چاہیے جس طرح پہاڑ کی رو رستے کے موڑ توڑ اور پیچ و خم کے ساتھ رُخ بدلتی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر مقام کے مقتضا کے موافق تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے۔ اگر علمی اور تاریخی

مضامین میں دریا کے بہاؤ کی سی روانی ہے تو مذہبی اور پولیٹکل تحریروں میں چڑھاؤ کی ترائی کا سا زور ہے۔

اعتراضات کے جوابات میں متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعووں کے مقابلے میں ظرافت اور خوش طبعی نصیحتیں نشتر سے زیادہ دل خراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں۔ غصّہ مہربانی سے زیادہ پُرلطف اور نفریں آفریں سے زیادہ خوش آیند۔ وہی ایک قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں ایک مورلسٹ کے ہاتھ میں معلوم ہوتی ہے تو عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں، اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکرٹیری کے ہاتھ میں۔

(مولانا الطاف حسین حالی مرحوم)

مولوی نذیر احمد بجنوری ثم الدہلوی

تذکرہ :- مولوی نذیر احمد کی ولادت ۱۸۳۱ء میں ضلع بجنور کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ نو برس کی عمر تک انھوں نے اپنے والد مولوی سعادت علی سے تعلیم پائی۔ پھر دلی آکر مولوی عبد الخالق کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ بعد ازاں دہلی کالج میں داخل ہو کر عربی، ادب، فلسفہ اور ریاضی میں کمال حاصل کیا۔ یہاں سے نکل کر پنجاب پہنچے، اور پچیس روپے ماہوار پر معلم ہو گئے۔ غدر میں کسی انگریز خاتون کی جان بچانے کے صلہ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنا دیے گئے۔ الٰہ آباد کے زمانۂ قیام میں انہوں نے از خود انگریزی زبان سیکھی۔ اور ایسی اچھی سیکھی کہ تعزیرات ہند کے ترجمہ کی خدمت اُن کے سپرد ہوئی۔ حکومت نے اس خدمت کے اعتراف میں انہیں پہلے تحصیلدار اور پھر افسر بندوبست بنا دیا اسی زمانہ میں آپ نے مرآۃ العروس لکھی، جس پر سرکار انگریزی نے ایک ہزار روپے نقد اور ایک گھڑی انعام میں دی۔ مولانا کی قابلیت کا شہرہ سُن کر سر سالار جنگ اوّل نے حکومت ہند سے اُن کی خدمات اپنے یہاں منتقل کرائیں۔ حیدر آباد میں سر سالار جنگ کے ایماء پر انہوں نے ایک نصابِ تعلیم تیار کیا۔ اور عرصہ تک ملازمت کرنے کے بعد وہاں سے سُبک دوش ہو کر دلی چلے آئے اور بقیۃ العمر تصنیف و تالیف میں گذار دی، ۱۹۱۳ء میں وفات پائی۔

علمی خدمات کے اعتراف میں وہ شمس العلماء بنائے گئے۔ بعد کو

اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل، ایل، ڈی کی اعزازی سند گھر بیٹھے بھیج دی۔ مولانا عمر بھر علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور تحریک علی گڈھ کے زبردست حامی رہے۔

تبصرہ :- مولانا اُردو زبان کے پہلے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے کئی کتابیں اپنے بچوں کے لئے لکھی تھیں۔ جو سب کی سب معاشرتی اور اصلاحی ہیں۔ اُن کی زبان بھی نہایت آسان ہے۔ البتہ روزمرہ اور محاورات کی بھرمار ہے۔ ان کی نثر کا امتیازی پہلو ان کا ظریفانہ رنگ ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ ظرافت کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی نمایاں ہے۔

تعلیم نسواں کے متعلق اُن کی یہ کتابیں نہایت دل چسپ اور سبق آموز ہیں۔ مراۃ العروس، بنات النعش اور رویائے صادقہ ناولوں میں توبۃ النصوح اور ابن الوقت بہت مشہور ہیں۔ مذہبی کتابوں میں ترجمہ قرآن شریف، ادعیۃ القرآن اور الحقوق والفرائض نہایت مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ بعض انگریزی قوانین کے ترجمے ہیں جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شہرت میں اُن کا کوئی ہم عصر شریک نہیں۔ قوانین کے ترجموں نے انہیں گورنمنٹ اور پبلک سے روشناس کیا۔ قرآن شریف کے ترجمہ نے انہیں مسلمانوں میں مقبول کیا۔ اور ناولوں کی وجہ سے اُن کا نام بلاقید مذہب و ملت ہر گھر میں پہنچ گیا۔



ڈپٹی نذیر احمد

آردو کا پہلا ناول نگار

توبۃ النصوح

کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی۔ لیکن مرزا جیسے نکمے بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب نہ دارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا دہ بھی حقیقی نہیں۔ ابتدائے علمداری سرکار میں صاحب ریزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو عالی جاہ سرکار۔ دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار۔ تیسرے ان دونوں کی بے عنوانی اس پر خود اس کی رشوت ستانی۔ بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اقتدار دہلی کے رودارؤں میں ہو گیا۔

مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجودیکہ دور کی قرابت تھی حسبۃً للہ اس کا تکفل اپنے ذمہ لے لیا۔ جمعدار اپنی حین حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے، پوتے، نواسے کثرت سے تھے، انہوں نے بے اعتنائی کی۔ اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر کے مرے تھے۔ مگر ان کے ورثا نے بہزار دقت محل سرائے کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا قطعہ ان کے رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینہ کی کرایہ کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔

یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی تین تین آدمی اور سات روپیہ کی کل کائنات، اس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار

کے بیٹوں کی برابری کرے - جن کو صدہا روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی تھی - اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے - مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا یہ کسی کو بھائی جان - کسی کو ماموں جان - کسی کو خالو جان بناتا - اور وہ لوگ اس کے اوٗعائی رشتوں، ناطوں سے بہت جلتے - اور دق ہوتے - اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا - اُن کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیروں کی سی اختیار کر رکھی تھیں - مگر امیرزادگی نبھتی تو کیسے نبھتی - دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں - ماں بیچاری بہتیرا بکتی - مگر کون سنتا تھا -

کلیم سے اور مرزا سے محفلِ مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا - شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے - یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی گویا ایک جان دو قالب تھے - کلیم کو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا - مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام دن اُن کے پاس رہتے - مرزا نے اپنا حال اب کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا - اور وہ جمعدار کی محل سرا اور جمعدار کے کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا - اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا - تو سیدھا جمعدار کی محل سرائے کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا - بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں - اور اُن میں سے ایک نے پوچھا - کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے ؟

کلیم :- " جاؤ مرزا کو بھیج دو "

لونڈی :۔ "کون مرزا ؟"

کلیم :۔ "مرزا ظاہر دار بیگ ! جن کا مکان ہے۔ اور کون مرزا ؟"

اتنا کہہ قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے کہ جلدی سے کلیم نے کہا۔ کیوں جی ! کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے ؟

لونڈی :۔ "ہے کیوں نہیں ؟"

کلیم :۔ "پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں ؟"

لونڈی : خدا جمعدار کے وارثوں کو سلامت رکھے۔ مُوا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے ؟

دوسری لونڈی :۔ "اری کمبخت ! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے۔ (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نا ! جن کی رنگت زرد زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دُبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں ؟"

کلیم :۔ "ہاں ہاں وہی ظاہر دار بیگ !"

لونڈی :۔ "تو میاں ! اس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ اُس میں رہتے ہیں !"

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے۔ آہا ! آپ ہیں ! معاف کیجئے گا۔ میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت

نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو ہم رکاب چلوں۔"

کلیم: "چلیئے گا کہاں! میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔"

مرزا: "پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں؟"

کلیم: "میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔"

مرزا: "بسم اللہ! تو چلیئے۔ اسی مسجد میں تشریف رکھیئے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔"

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پُرانی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی ویران وحشتناک، نہ کوئی حافظ ہے نہ ملّا، نہ طالب علم نہ مسافر، ہزار ہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھربخے کا فرش بن گیا ہے۔

مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے۔ مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدّر فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے خفقان کا عارضہ اختلاجِ قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا ہوں تو اُن کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی ہے۔ پہلے یہ تو فرمایئے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار۔ تمام ماجرا کہہ سُنایا۔

مرزا: "پھر اب ارادہ کیا ہے؟"

کلیم :- سوائے اس کے کہ گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے - اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا :- خیر نیت شب حرام صبح تو ہو - آپ بے تکلف استراحت فرمایئے میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں - اور مجھ کو مریضہ کی تیمار داری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے -

کلیم :- "یہ ماجرا کیا ہے - تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے - کئی پائیں باغ ہیں - حوض حمام اور کٹرے اور گنج دکانیں اور سرائیں، میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی مِلک نہ بتایا ہو - یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے - ان سے ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو - لیکن میں اس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا :- "آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے - اتنی مدت مجھ سے اور آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا - یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں، اس کی ایک وجہ ہے - بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنیٰ کیا تھا - اور اپنا جانشین کر مرے تھے - شہر کے کل روسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں - ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں - بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے - صحبتِ ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا - لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں - اسی روز سے اندر باہر وادیلا مچی ہوئی ہے - اور اس بات

کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں۔

کلیم :۔ "لیکن آپ نے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا؟"

مرزا :۔ "اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا، تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت اور حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور مریض کی تیمارداری کروں؟"

کلیم :۔ "خیر مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے؟"

مرزا :۔ "چراغ کیا۔ میں نے لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے۔ اور آپ زیادہ پریشان ہو جئے گا۔ اور اس مکان میں ابابیلوں کی بہت کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے۔ اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی۔ اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا، مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود ہی پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔

مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی نہایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے

متعرض ہی نہ ہوا۔ اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا۔ اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے۔ تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سُنو یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا: "سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو؟"

کلیم: "تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں"

مرزا: "مردِ خدا تو نے آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دکانیں سب بند ہو گئیں۔ اور جو دو ایک دکانیں کھلی بھی ہیں۔ وہ باسی چیزیں لگائی گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر۔ گھر میں تو آج آگ تک نہیں سلگی۔ مگر ظاہرا تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آئی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بھنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو اور تم کو دونوں کو کافی ہو گی۔ رات کا وقت ہے"

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ گئے تھے یا تو کم لائے، یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے۔ اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا: "یار ہو بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگائیے۔ دیکھو تو کیسے جھلس رہے ہیں۔ اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب

ہی دل فریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا۔ مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھئے! اتنی تو رات گئی ہے، مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سے سُنا ہے کہ حضور والا کے خاصہ میں چھدامی کی دکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے۔ اور واقعہ میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے بھئی تمہیں میرے سر کی قسم! سچ کہنا۔ ایسے خوب صورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دانوں کی رنگت دیکھئے۔ کوئی بسنتی ہے کوئی پستئی۔ غرض دو نوں رنگ خوش خاصہ ہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں۔ لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سُنی ہے؟"

کلیم: "فرمایئے!"

مرزا: "یہ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے۔ فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جیوں جیوں میں نے زمین سے سر نکالا۔ تیرِ ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں۔ مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی پر نہیں ہوتے۔ نشو و نما کے ساتھ تو میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے، اور مجھے کچّے کو کھا جاتے ہیں، جب بار آور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکرے کی طرح لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔

اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کئے۔ پکا تو شاخ و برگ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا، رہا دانہ، اس کو چکی میں دلیں، گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں۔ بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں۔ گھونگھنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔

چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح بے باکانہ چٹر پٹر بولنا سن کر حاضرین دربار اس قدر خوش ہوئے کہ ہر شخص اس کے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم آخر رخصت ہوا۔ سو حضرت! یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندانِ آزان پر تیز ہیں۔ افسوس کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا۔ ورنہ میر مدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں!!!

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔

کلیم بھوکا تو تھا ہی۔ اس کو بھی ہمیشہ سے بھی زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانے اور اور عشرت منزل میں تھا، یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا۔ اور مسجد بھی ایسی جس کا حال ہم نے تھوڑا سا اوپر بیان کیا۔

گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے نہ چراغ، نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس، نہ غم خوار، نہ نوکر نہ خدمتگار۔ مسجد میں اکیلا بیٹھا تھا، جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مرغِ نو گرفتار، اور کوئی

ہوتا، تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا۔ اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا۔ اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوچنے کو تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا۔ اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔

صبح ہوتے ہی آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم، مرزا یا محلّے کا کوئی اور عیار ٹوپی جوتا، رومال، چھڑی، تکیہ، دری یعنی جو چیز کہ کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی، لے کر چمپت ہوا۔ یوں بھی کلیم بہت دیر تک سو کر اٹھتا تھا۔ اور آج تو ایک خاص وجہ تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا، تو دیکھتا کیا ہے کہ فرشِ مسجد پر پڑا ہے۔ اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں، تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا، قلب ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو اِدھر اُدھر دیکھا، کہیں پتہ نہیں۔ مسجد تھی ویران، اس میں بانی کہاں! صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آ نکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں، یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔

اس میں دوپہر ہونے آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا، جونہی زینہ پر چڑھا، تو کلیم اس سے عرض مطلب کرنے کے لئے لپکا۔ وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ، ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے۔ اس نے اس کو بھوت سمجھا یا سٹری خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا۔ اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے ہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی۔ اور جب اندھیرا ہوا تو اُلّو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا۔ آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے

قطب صاحب بسدھارے ہیں۔کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منہ دھونے کو پانی مانگے ۔ اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی۔ تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے ۔

یہ سوچ کر اُس نے کہا کہ کیوں حضرت ! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں ؟

اندر سے آواز آئی "ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے ۔ اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو"

کلیم :- "میرا نام کلیم ہے ۔ اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے ۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا"

گھر والے :- "وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمہارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا ۔

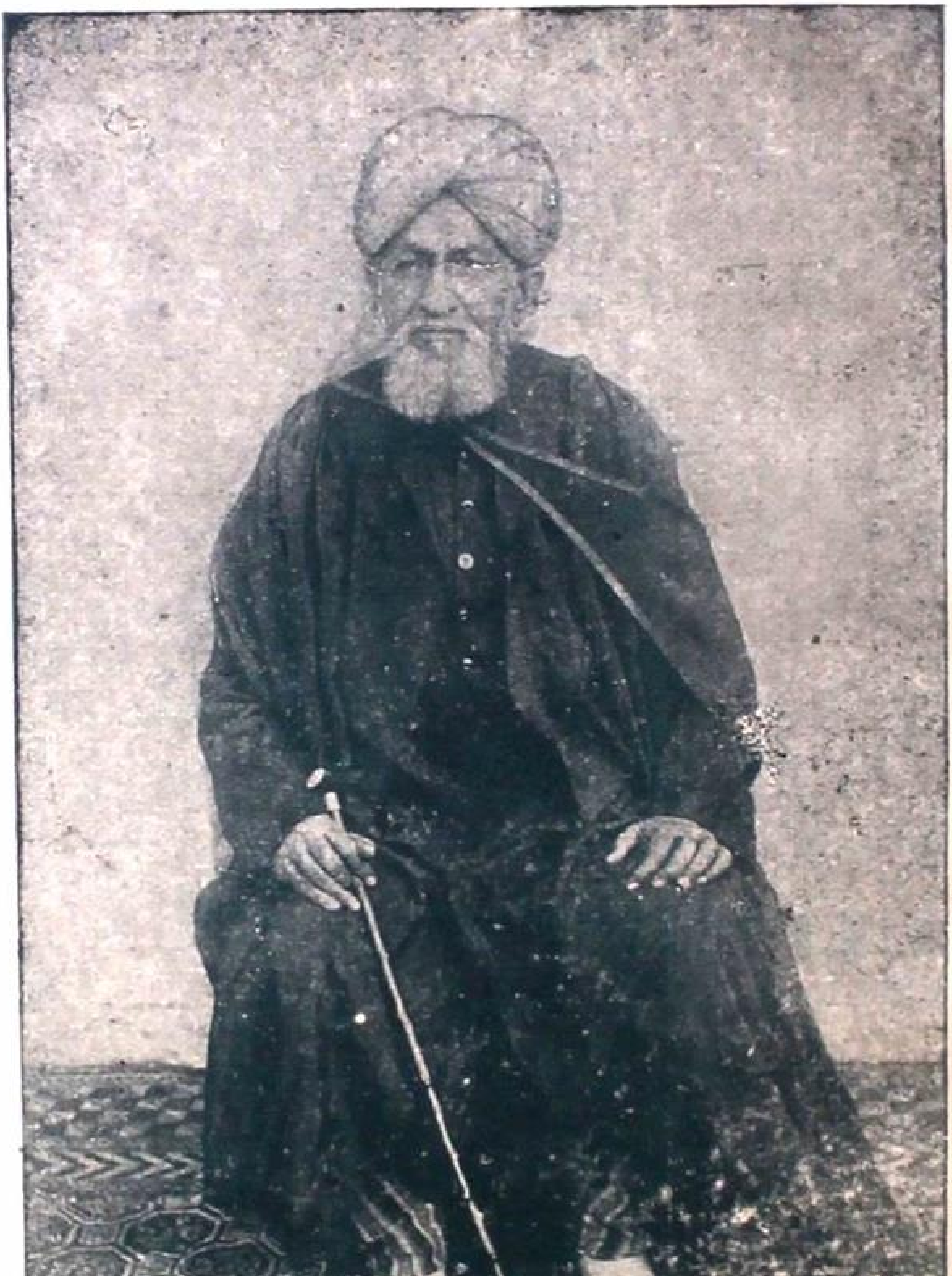
تکیہ و دری کا نام سُن کر کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا کہ اندر سے آواز آئی ۔ مرزا زبردست بیگ دیکھنا ! یہ مردوا کہیں چل نہ دے ۔ دوڑ کر تکیہ دری تو اُس سے لو ۔

کلیم یہ بات سُن کر بھاگا ۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے چور چور کر کے جا لیا ۔

ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کئے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر ۔ اُس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا ۔

شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی

مولوی صاحب کا سال ولادت ۱۸۳۲ء ہے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ سے جا ملتا ہے جس خاندان سے آپ کا تعلق تھا وہ کئی نسلوں سے تیمور کے شاہی گھرانے کی اتالیقی کے فرائض ادا کرتا رہا۔ آپ کے والد کا نام محمد ثناء اللہ تھا جو اپنی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے دہلی میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد اور خواجہ حالی کے ہم جماعت تھے۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر تھے آپ کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ حکومت نے آپ کو علمی خدمات کے صلہ میں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا تھا۔ مولوی صاحب ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، ادب، اخلاق اور سیاسیات کے ماہر تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد اتنی ہے کہ اگر ایک ایک جلد ایک دوسرے کے اوپر رکھی جائے تو اوسط قد کے انسان سے بڑھ جائے گی ان کی تاریخ ہندوستان دس ضخیم جلدوں میں ختم ہوئی ہے، ریاضی میں بھی ان کی ان گنت کتابیں ہیں، مولوی صاحب اکثر مشہور رسالوں اور رسالوں کے باقاعدہ مضمون نگار بھی تھے، آپ جو کچھ لکھتے تھے نہایت غور و فکر سے، یہی وجہ ہے کہ جس مضمون کو دیکھئے پُراز معلومات اور نتیجہ خیز ہے۔ آپ تحریک علی گڈھ کے علمبرداروں میں تھے اور علی گڈھ کالج سے آخر وقت تک ترقی کی



مولانا ذکاءاللہ دہلوی

حیثیت سے وابستہ رہے، مولوی صاحب کا طرزِ تحریر سنجیدہ اور فلسفیانہ ہے۔ آپ کی زبان بہت سلیس اور سادہ ہے۔ عبارت آرائی اور رنگیں بیانی سے انہیں کوئی سروکار نہیں، آپ نے مرحوم دہلی کالج میں تمام مضامین کی تعلیم اُردو کے ذریعہ پائی تھی اور اس لئے آپ ہمیشہ اس کے مؤید رہے کہ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو آپ نے اُردو کو قومی زبان بنانے کے سلسلہ میں جو کوششیں کیں ان کی وجہ سے آپ کا نام تاریخ میں ہمیشہ روشن رہیگا

کتب کا مطالعہ

مطالعہ تنہائی و عزلت میں خوشی بخشتا ہے۔ گفتگو و تقریر میں حسن بیان پیدا کرتا ہے۔ معاملات کے فیصلہ کرنے اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات اور مقدمات کا تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں مگر مقدمات اور منصوبوں کی ترتیب اور عام اصلاح کی تدابیر جیسی کہ چاہیئے، اچھے عالم و فاضل ہی کرتے ہیں۔ تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے اور ان کی باتوں کی تردید کریں گے یا سب باتوں کو یقین اور تسلیم کریں گے یا ہم خود بہت سی باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصد اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے اور سوچیں گے پھر جو عمل کرنے کے قابل ہوں گی اُن پر عمل کریں گے بعض کتابوں کا صرف مزہ چکھا جاتا ہے بعض بالکل نگلی جاتی ہیں یعنی کُل پڑھی جاتی ہیں مگر بے توجہی اور بے غوری سے بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کر ہضم کی جاتی ہیں کتابوں کے انتخابات سے جو کتابیں بنتی ہیں ان کا حال آبِ مقطر کا سا ہے۔ آدمی پڑھنے سے کامل بنتا ہے

اس سے تقریر شستہ اور تحریر چُست و درست ہو جاتی ہے، تاریخ کا مطالعہ آدمی کو دانشمند و تجربہ کار بنا دیتا ہے۔ نظم کا، طبیعت میں جودت پیدا کرتا ہے، علوم ریاضیہ کا طبیعت کو ذکی بناتا ہے اور علوم طبعیہ کا ذہانت کو عمیق، علم اخلاق کا سنجیدہ و متین، منطق، علم بلاغت و فصاحت کا مباحثہ و مناظرہ کی قابلیت پیدا کرتا ہے غرض مطالعے کا اثر ضرور انسان کے اوضاع و اطوار و کردار پر ہوتا ہے۔ انسان کے امراضِ جسمانی کے جیسے خاص علاج ہیں، ایسے ہی امراض ذہنی کے بھی مخصوص علاج ہیں، سینہ و شُش کا علاج شکار معدے کا علاج صبح صبح قدم قدم چلنا، دماغ کا علاج گھوڑے پر سوار ہونا، علیٰ ہذا القیاس اور علاج ہیں، اسی طرح اگر ذہن میں آوارگی و پریشانی ہو تو علوم ریاضیہ کا مطالعہ اس کا علاج ہے جو اُس کے ذہن کی پریشانی کو کھو دے گا اگر ذہن بے تمیز ہے، کہ وہ دو چیزوں میں تمیز اور فرق نہیں کر سکتا تو حکمت و فلسفہ اس کا علاج ہے۔ اگر ذہن ایسا ہے کہ وہ ایک بات کے ثبوت سے دوسری بات کی توضیح نہیں کر سکتا، تو قانون دانوں کے فیصلہ جات کا پڑھنا اس کی دوا ہے۔ غرض امراض ذہنی کے ایسے ہی علاج ہوتے ہیں۔ مطالعۂ کتب میں تو عاقلوں سے باتیں ہوتی ہیں اور کاروبار زندگی کے معاملات میں بیوقوفوں سے جو مطالعۂ کتب ہمارے کاروبار زندگی میں کام نہیں آتا، اُس کو بھی بیکار نہ جانو کیونکہ وہ ہماری عقل و فہم کو درست کرتا ہے۔ مطالعہ ہی ایک ایسا فن ہے جو اور فنوں کے استعمال کو سکھاتا ہے۔ دانشمندوں کے کلام کے مطالعہ پر نوجوان اپنے دماغ کو متوجہ کرے گا تو ابتدا میں مسرت حاصل ہو گی۔ پھر دانائی کے ساتھ مواصلت کسی مطالعہ سے مضرت کبھی نہیں ہوتی بلکہ ہر مطالعہ کے ساتھ مسرت ہے

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم کے پیچھے پڑنے سے صحت کو مضرت پہونچتی ہے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والوں کی عمریں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اور پیشے والوں کی، اس مشاہدے کی صداقت کی شہادت تاریخ بھی دیتی ہے۔ طالب علموں کی باقاعدہ اور آرام کی زیست صحت و تندرستی کو زیادہ کرتی ہے اور بہت سی تکالیف و امراض سے بچاتی ہے مگر اس کے ساتھ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اپنی فضول حرارتِ جسمانی کو معتدل ورزشِ جسمانی سے کم کرتا ہے اور جسم کو کاہلی کا عادی نہ بنائے۔ آدمی اپنے وقت کاٹنے کے لئے حقہ پیتے ہیں، ہلاس سونگھتے ہیں اور اس سے مسرور ہوتے ہیں اب اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ جو لوگ کسی فن یا علم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کا وقت کیسا خوشی سے کٹتا ہوگا۔ ابتدا میں جو اس کے اندر کچھ محنت معلوم ہوتی ہے وہ آگے جاکر تفریحِ طبیعت ہو جاتی ہے۔ جب آسمان پر چاند کی چاندنی کا لمپ روشن ہو تو یہ وقت تیرے مطالعہ کے لئے اچھا ہے کہ تیری کتاب کے صفحوں پر چاندنی پڑے اور تو اس میں باریک اور تاریک معانی کو دیکھے اور چاند اور ستاروں کی سحرکاری کو سمجھے۔

نفس کے واسطے مطالعہ ایسا ہے جیسے جسم کے واسطے ورزش۔ ورزشِ جسمانی سے تنومندی اور تندرستی حاصل ہوتی ہے مطالعہ سے نیکی جو روحانی صحت ہے ہاتھ آتی ہے، ورزش سے جو خاص قسم کی تنادری کے لئے کی جائے، کچھ تکان ہوتی ہے۔ اسی طرح مطالعہ سے بھی جو فقط نکوکاری کے واسطے کیا جائے کچھ تکلیف ہوتی ہے مگر جب کہیں پسندیدہ کام سے مسرت پیدا ہوتی ہے تو اس کی تکلیف اور تکان کی پرواہ نہیں ہوتی، شکار کھیلنے سے مسرت و صحت ایسی حاصل ہوتی ہے کہ اس کی

محنت راحت معلوم ہوا کرتی ہے - ایسے ہی تمثیلات اور نقل وحکایات کے اور نصائح کے مطالعہ سے انبساط وصحت روحانی حاصل ہوتی ہے اور اُس کی محنت کچھ نہیں معلوم ہوتی - بعض مطالعہ کرنے والے ایسے نادان ہوتے ہیں کہ متقدمین کی وہ کتابیں مطالعہ میں رکھتے ہیں جن کا بہت سا حصّہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن جہاں کہیں کوئی مضمون ان کی سمجھ میں آجاتا ہے تو خوشی کے مارے اُچھل پڑتے ہیں اور کپڑوں میں پھولے نہیں سماتے - لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ دس باتوں میں سے ایک سمجھ میں آئی تو کیا آئی -



علامہ شبلی نعمانی

جنہوں نے اردو ادب کو فلسفہ' تاریخ سے آشنا کیا

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے یہیں مکتب میں قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم پائی۔ پھر اعظم گڈھ، غازی پور، رام پور اور لاہور میں قرآن حدیث، فقہ، اصول عربی ادب، منطق و فلسفہ وغیرہ کی تکمیل کی اور ۱۹ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ اس کے بعد حج کعبہ کا شرف حاصل کیا اور اسلامی ممالک کی بھی سیاحت کی۔

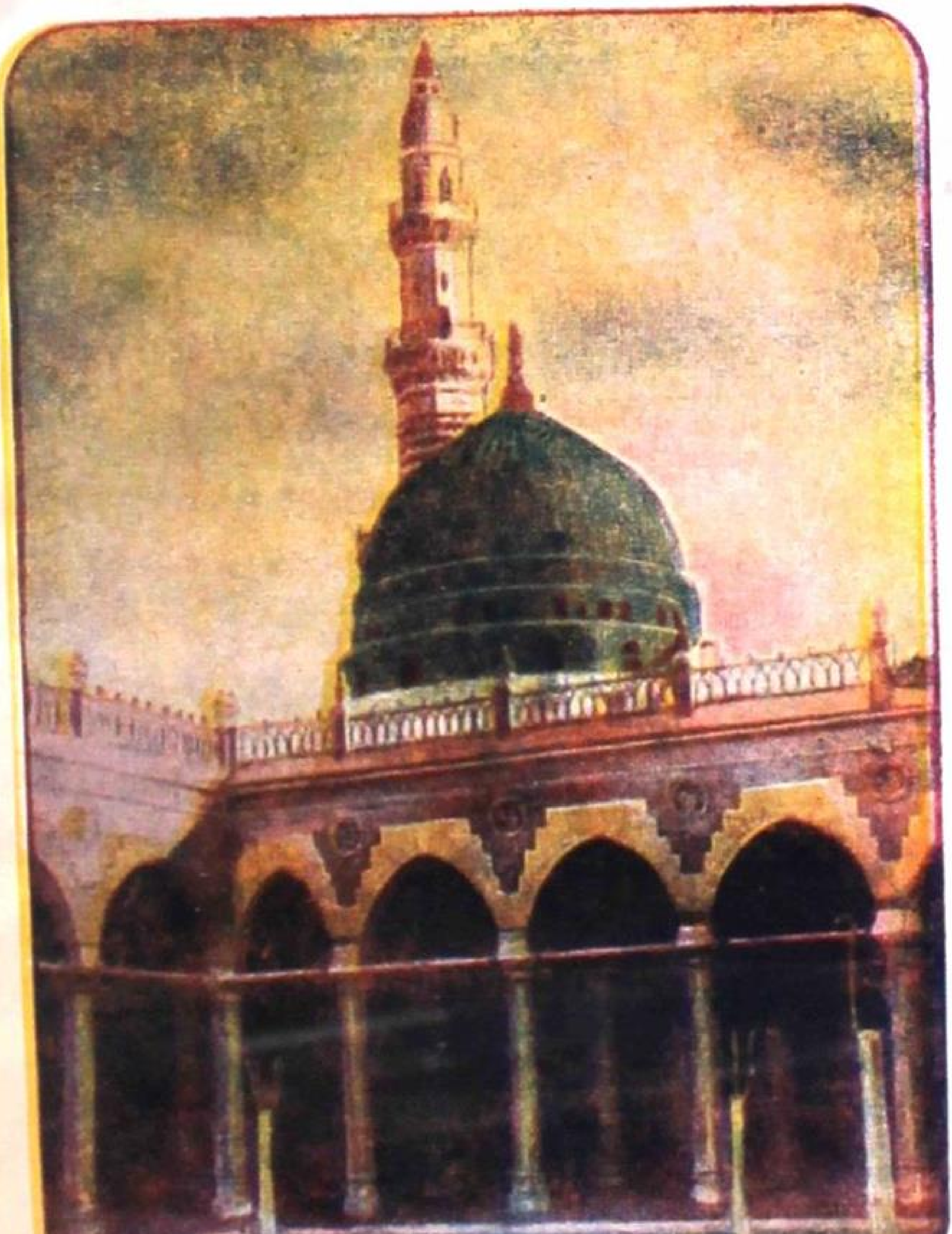
آپ کے والد شیخ حبیب اللہ کا پیشہ وکالت تھا اس لئے والد کے اصرار پر انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کر کے اعظم گڈھ ہی میں وکالت شروع کی۔ ظاہر ہے کہ دیانت داری، راست بازی اور تقویٰ کا پابند شخص کامیاب وکیل نہیں بن سکتا۔ جلد اس مشغلہ کو ترک کر کے کلکٹری میں ایک چھوٹی سی ملازمت کر لی مگر اس کے خرخشوں نے انہیں بہت جلد بددل کر دیا اس لئے اسے بھی چھوڑ دیا۔ علی گڈھ کالج پہنچے اور وہاں عربی فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے، یہیں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا یہیں مسٹر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور انہیں عربی پڑھائی سولہ سال کے بعد سرسید کی وفات پر اعظم گڈھ چلے آئے اور یہاں سے حیدرآباد پہنچکر ناظم محکمۂ تعلیم ہو گئے۔ بعدازاں لکھنؤ آکر ندوۃ العلماء کی

خدمات انجام دیں۔ یہاں سے الگ ہو کر اپنے وطن اعظم گڈھ میں پہنچے اور دار المصنفین کی بنیاد ڈالی۔ ان کی آخری تصنیف سیرۃ النبی ہے، جو اُردو زبان میں سیرت پر سب سے بڑی اور سب سے اچھی کتاب ہے۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں وفات پائی مولانا شبلی کو خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی نے مجیدیہ تمغہ اور انگریزی حکومت نے شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا۔

شبلی کا انداز تحریر شستہ، مدلل اور دل نشین ہے۔ جب خطیبانہ انداز پر اُتر آتے ہیں تو اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب کا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ ان کے لطیف استعارے، اور نازک تشبیہیں عبارت کی دلکشی و دل آویزی کو چار چاند لگا دیتی ہیں اگر اسلام کی قدیم شان و شوکت کی تاریخ کو طرز جدید میں دیکھنا چاہو تو المامون، الغزالی، سیرۃ النعمان۔ الفاروق اور سیرۃ النبی کا مطالعہ کرو۔ کمال تنقید کے لئے شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کی سیر کرو۔

مولانا شبلی نے اُردو شعر گوئی کی طرف کم توجہ کی، مگر جو کچھ کلام ان کا اُردو میں موجود ہے اس سے ان کی قادر الکلامی ظاہر ہے ان کی سیاسی نظمیں اپنے زمانہ میں بہت مشہور رہوئیں۔

ان کے ممتاز شاگردوں میں ابو الکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔



روضۂ مبارک

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِ کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازیِ موسیٰؑ، جاں نوازیِ مسیحؑ، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں کام آویں گے۔

آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ "آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا" لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتشکدۂ کفر، آذرکدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی۔ آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اُٹھا۔

یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب۔ فرمانروائے عالم۔ شہنشاہِ کونین تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت داں عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے دلائلِ ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپؐ کی ولادت ۹ ربیع الاوّل روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی۔

آپؐ کا نام "محمّد" رکھا گیا، اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ حضور کے چچا عبدالمطلب نے یہ نام رکھا تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابھی چار ہی سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی آغوش اور لکھنؤ کی نکھری ہوئی فضا میں تربیت پائی۔ سرشار کی تعلیم فارسی سے شروع ہوئی۔ انگریزی اور عربی میں بھی اچھی خاصی استعداد حاصل کی۔ ضلع اسکول کھیری میں مدرس ہو گئے یہیں سے "مراسلہ کشمیر" اور "اودھ پنچ" میں اپنے شوخ رفتار قلم کی جولانیاں دکھانے لگے۔ پھر اسکول چھوڑ کر اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو کر نول کشور پریس میں آ گئے۔ سرشار نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "فسانۂ آزاد" کا سلسلۂ مضامین اسی اخبار میں شائع کرنا شروع کیا۔ ایک سال میں یہ ضخیم کتاب چھپ کر بازار میں آ گئی۔ سرشار کو ترجمہ میں بڑی مہارت تھی وہ الٰہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم ہو گئے مگر دفتری پابندیوں کے متحمل نہ ہو سکے، اور استعفیٰ دے کر حیدرآباد دکن پہنچے۔ جہاں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اپنے کلام کی اصلاح کے لئے دو سو روپیہ ماہانہ بطور نذرانۂ عقیدت مقرر کر دیا۔ سرشار کی مے نوشی کی عادت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی آخر یہی موت کا سبب ہوئی اور ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا۔

سرشار بلا کے ذہین تھے، قوت حافظہ بھی غضب کی پائی تھی، نہایت بذلہ سنج، حاضر جواب ظریف و خندہ جبیں تھے۔ اُردو زبان و ادب میں ان کا مرتبہ موجد کا ہے۔ وہ صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی زبان میں سلاست و

روانی کے ساتھ ساتھ زورِ کلام بھی تھا۔ لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے ماہر تھے یہی وجہ ہے کہ فنِ افسانہ نویسی میں کمال دکھایا۔ سرشار کا شاہکار فسانۂ آزاد ہی ہے جس میں لکھنؤ کی قدیم تہذیب کی چلتی پھرتی۔ ہنستی۔ بولتی ہستیاں اپنی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ بڑی ہوشیاری چابکدستی اور خوش ادائی سے پیش کرتی ہیں۔ جا بجا پھڑکتے ہوئے فقرے، برمحل لطائف و ظرائف اور ترکی بہ ترکی جواب اس افسانہ کے پڑھنے والے کی دلچسپی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ یقین ہے کہ جب تک اُردو کا نام باقی ہے فسانۂ آزاد کی شہرت بھی باقی رہیگی۔

سرشار نے "سیر کہسار"، "طوفان بے تمیزی" اور کئی ایک ناول بھی لکھے ہیں۔

برسات کا موسم اور ایک نواب زادے کی سیر

اتنے میں جنگلے کی طرف سے کالی کالی گھٹا اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام گلستانِ عالم پر چھا گئی۔ ؎

آمدِ فصلِ بہاری ہے آج — جوش پر رحمتِ باری ہے آج
زورِ پُرشور گھٹا اٹھی ہے — کیسی گھنگھور گھٹا اٹھی ہے
کیا گھٹا ٹوپ ہے چھایا بادل — چاروں جانب سے گھر آیا بادل
جس طرف دیکھو گھٹا ہے چھائی — آج چلتی ہے ہوا پروائی

اب سنیئے کہ بہار کی رُت، سہانا سماں، در و دیوار نورانشاں، پھر وہ کوٹھی عالی شان، لطافت کی روح، نزہت کی جان۔ سامنے خانہ باغ۔ زینت و فرحت کا



پنڈت رتن ناتھ سرشار

لکھنوی تمدن کا ترجمان

چشم و چراغ، اشجار ہرے بھرے گلبن پھولے پھلے۔ بوٹا بوٹا خضارت آگیں، شاخ شاخ بہار آفریں، سبزان چمن کا دھانی لباس۔ پھولوں کی مست کر دینے والی بوباس۔ نرگس شہلا کی نظارہ بازی۔ سوسن آزاد کی زباں درازی، برگ برگ گل کی رنگ آمیزی، نسرین و نسترن کی لخلخہ بیزی، شگوفے حجرہ نشین، کہیں سمن، کہیں یاسمیں، جو پھول ہے خندہ رو، کشادہ جبیں، نازک اندام و نازک آئیں، نو عروس بہار کا نکھار قابلِ دید ہے۔ شاہدانِ چمن پردہ عالم ہے کہ دید ہے نہ شنید ہے، گل اور رنگ رشکِ نگار خانۂ ارژنگ۔ الغرض جو روش ہے وہ اس درجہ غالیہ بار ہے کہ مشام جاں رشک طبلۂ عطار ہے۔ موجِ ہوا شانہ کش جعد خوبانِ فرخار ہے۔ تختہ تختہ بجائے خود ایک گلزار ہے۔ نسیم عنبر بار کی مشاطگی و نگار بندی سے سبزہ سبز بخت ہے۔ موسم گل اور سیر و تفریح کا وقت ہے۔ نونہالانِ چمن کی چہرہ افروزی اور بادِ نوروزی نے ستم ڈھایا ہے، اس پر طرہ یہ ہے کہ ابرِ سیاہ جھوم جھوم کر آیا ہے۔ چمن کیا ہے نمونۂ قدرتِ بیچون ہے اور موسم موسمِ جوشِ جنوں ہے۔ ؎

عشرت میں بلبلوں کو قفس کا نہیں خیال
گلچیں سے اب گلوں کو نہ مطلق رہا ملال

از خود شگفتہ ہو گئے غنچوں کا ہے یہ حال
بھولے ہوئے ہیں کبک دری اپنی چال ڈھال

ہر برگ بوستانِ جہاں کا نہال ہے
شمشاد جھومتے ہیں خوشی کا یہ حال ہے

بادِ نسیم رقص کناں ہے چمن چمن
پھولے نہیں سماتے ہیں جامے میں گلبدن

مہکی ہوئی ہے چار طرف بوئے نسترن
یہ گل نئے کھلے ہیں کہ سوسن ہے خندہ زن

ہر خار پر گلوں سے سوا کچھ بہار ہے
بلبل کا ذکر کیا رگ جاں بے قرار ہے

ادھر یہ کالی کالی گھنیری گھٹا چھائی، ادھر نواب نامدار نے اپنی فٹن تیار کرائی کہ برج بری منزل کی سیر کر آئیں۔ غرض شام کا وقت تھا کہ یہ رئیس زادہ گردوں مدار مع مصاحبین بدکردار رولائتی بیش بہا فٹن پر سوار ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھانے نکلے۔ خود گپیں اُڑاتے قہقہے لگاتے تھے اور سمندِ خوش خرام، تیزگام، جاناں طرحدار کے مزاج کی طرح یوں بل کرتے چلے جاتے تھے کہ بجلی بھی ان کے مقابل گرد اور چھل بل میں ہرن کی گرمیِ بازار بھی سرد تھی۔

جھمن نے کہا۔ حضور خدا چشم زخم حوادث سے بچائے، اس وقت تو واللہ ریل گاڑی کے بھی انجر پنجر ڈھیلے ہو جائیں۔ دونوں گھوڑیاں جوگڑیاں بھرتی تھیں۔ اوہو ہو ہو! اے صلِّ علیٰ! ابھی پرسوں ہی کا ذکر ہے بڑے حضور کی خواصی میں بندہ بھی بیٹھا تھا۔ پلٹن کے جو جنڈیل ہیں کوئی تیس ہزار روپیہ مہینہ طلب پاتے ہیں۔ بس بس حضور اُن کی مُشکی جوڑی اور دونوں ویلا۔ کوئی پانچ پانچ ہزار کے گھوڑے سامنے سے جوڑی آئی اور ہماری گاڑی کے آگے نکال لے گیا۔ اے حضور یقین مانئے بس پھر تو گھوڑیاں آگ بھبوکا ہو گئیں اور ذقن بھر کر اس طرح جھپٹیں کہ میری مندیل گرتے ہی دو کوس کے سپٹے پر ہو رہی اور کوچبن کے حواس بلا اجازت فقرو۔ راس کو لاکھ کھڑا کرتا ہے۔ مگر تو بہ ہی بھلی۔ کروڑوں جتن کئے۔ ایک نہ چلی۔ جنڈیل کی گاڑی تو منزلوں دور رہ گئی اور اُنہوں نے جا کر جھٹ بردم لیا سو وہ بھی بہ ہزار خرابی۔ خداوندا اس وقت کنوتیاں دیکھنے کے قابل تھیں۔ اللہ جانتا ہے کھائی کا باپ بھی اس وقت سامنے آتا تو یہ پھاند جاتیں اور ہماری کھوپڑی کے بھی ماتھے جاتی۔ مگر حضور اس وقت میاں گھسیٹے نے بھی وہ کام کیا کہ لاٹ صاحب کے کوچوان سے بھی نہ ہو سکتا اور اَنیلا تو تمنہ کے بس

زمین پر آرہتا۔ قسم۔ بس یہ کیفیت تھی کہ جیسے ریل کا انجن ڈبل چال جائے۔

رئیس:۔ کیوں جی۔ گھسیٹے تم نے ہم سے یہ واردات بیان ہی نہ کی، وہ کون فرنگی تھا؟

گھسیٹے (کوچبین) حضور کوئی پلٹن کا تھا۔ گل مچھے رکھائے۔ وہ جو چشمہ لگاتا ہے۔

رئیس:۔ پھر تم گاڑی نکال لے گئے تھے؟

گھسیٹے:۔ اے حضور! نکال لینا کیسا خدا نے جان بچائی، اس دن ہم تو اپنے حساب کو چ ہی کر چکے تھے۔ جوں جوں روکتا ہوں ووں ووں وہ اور بھی تیزی کرتی ہیں۔ فیض آباد کی سڑک تک ناکوں دم آگیا۔ ایک بڑھیا کچلتے کچلتے بچی۔

رفیق:۔ ہاں! وہ! ارے توبہ! خدا نے بڑی خیر کی ورنہ برے پھنسے تھے۔

جھمن:۔ (جھلا کر) برے کیا خاک پھنسے تھے۔ ہماری سرکار سے صاحب لوگوں سے تپاک بڑھا ہوا ہے۔ واللہ بڑھیا مردار کے جا ہے پرخچے پرخچے اڑ جاتے، مگر حضور کے نوکروں پر آنچ نہ آنے پاتی۔

رفیق:۔ خدا خدا کر بندے۔ ہونھ! اے تیری قدرت! آپ اور ہم کو سکھائیں؟ میں نے تو یہ بات کہی کہ بوڑھی عورت بے چاری مفت میں کچل گئی ہوتی۔

رئیس زادے نے کوچبین سے کہا کہ میاں گھسیٹے جب جانیں کہ اسی دن کی طرح جوڑی کو تیز کردو۔ گھوڑیاں ہوا ہو جائیں اور بات کرتے وہاں پہنچائیں۔ کوچبین نے انعام کی طمع سے جوڑی کو تیز کیا تو ہوا سے باتیں کرتی چلیں۔ راستے میں جو دیکھتا ہے کہتا ہے بگھی کیا بھونچال ہے۔ آندھی رو گ ہے۔ جوڑی زوروں پر ہے۔ چلتے

چلتے موڑ پر ایک کمہار برتنوں کی کھانچی لئے ملا۔ کوچبین نے للکارا، سائیسوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا، ہائیٹ! ہائیٹ! آئی یو! جانے والا موڑ سے ہٹ جانا! آئی یو کمہار ارے موڑ پر سے ہٹ!

کمہار قوت سامعہ سے بے بہرہ، اور مارے بوجھ کے پسا جاتا تھا۔ قدم اٹھانا دو بھر۔ اور گھوڑیاں بگٹٹ چلی جاتی تھیں۔ موڑ پر پہنچتے ہی کمہار جھپیٹ میں آگیا۔ برتنوں کی کھانچی سر سے گری ارارادھوں۔ سب برتن چکناچور ہو گئے۔ چو طرفہ تماشائیوں کا ہجوم۔ کسی نے کہا ہائے ہائے "کمہار بے چارہ مرگیا" دوسرا بولا۔ "ٹانگ پاش پاش ہوگئی" تیسرے نے کہا "بیدھا تھا! پکارتے تو جاتے تھے ہٹا کیوں نہیں؟ دو کوس سے تو بگھی کے کھڑکھڑانے کی آواز آتی تھی"۔

کمہار کانپتے کو نکھتے اٹھا تو ٹانگ میں خفیف سی چوٹ بتائی۔ ادھر کوچبین نے کمہار کے گرتے ہی راس جو اٹھائی تو منڈیاؤں ہو رہا۔ رئیس زادہ بادقار اور مصاحبین حماقت شعار پیچھے پھر پھر کے دیکھتے جاتے ہیں کہ کوئی گرفتار کرنے تو نہیں آتا۔ رئیس زادے کا چہرہ زرد اور رنگ فق ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں پھولے نواب و مصاحب سب چوکڑی بھولے۔ میاں جھمن کانپتے ہیں۔ رفیق کا کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے اور کوچبین کی بس یہ کیفیت تھی کہ ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

جب منڈیاؤں پہنچے تو فٹن کو روک کر کوچبین نے پوچھا "حضور کیا حکم ہوتا ہے؟"

رئیس:- یہاں ہوش کس نامعقول کے ٹھکانے ہیں جو تم کو حکم دے۔ اُف! بس اب مارے پڑے غضب ہی ہو گیا۔ اس کمہار کی تو کوئی خبر لاؤ۔

جھمّن :- حضور اس وقت تازی تازی واردات ہوئی ہے۔ کس کو جان بھارد ہے۔ جو سانپ کے مُنہ میں انگلی دے۔

رفیق :- جو جائے وہی عزت گنوائے۔

رئیس :- گھسیٹے تم جا کے دیکھ آؤ۔

گھسیٹے :- اور حضور جوڑی کو یہاں کون سنبھالے گا ؟ اس وقت گھوڑیاں بدی پر ہیں۔

رئیس :- کھول ڈالو اور جاؤ۔ مگر کُتّے کی چال جاؤ اور بلّی کی چال آؤ۔

گھسیٹے :- وہ کتّے بلّی کی تو حضور نے ٹھیک کہی، مگر ہاتھے تو غلام کے جائیگی راس تو میرے ہاتھ میں تھی۔ میں جاؤں تو اسی دم دھرا جاؤں۔

رئیس :- اچھا کسی چاکر کو بھیجدو۔

ایک چاکر :- نا صاحب ہم کا ساڑھے تین روپیہ کی نوکریاں بہت مل رہیں۔

دوسرا چاکر :- ہاں ہجور چاکر ہی بھالتو ہیں۔

رئیس :- پھر اب ہونا کیا ہے۔ چودہ چودہ برس کو سب جائیں گے۔ ہم تو قانون وانون جانتے نہیں۔ جھمّن نے کہا "حضور ایک تدبیر غلام کو سوجھی ہے۔ قربان جاؤں کبھی پٹ پڑے"، پوچھا "وہ کیا ہے ؟" کہا "حضور تو یہاں اسی جگہ بستر جما دیں اور غلام تراب علی کو لے کر لپکتا ہوا جائے کسی فرنگی کونسلی کے ہاں اور جو رائے وہ دے اُس کے بموجب کارروائی ہو" فرمایا واللہ خوب سوجھی۔ "دیکھو جتنی بات ہو گی اتنی کہیں گے، لگی لپٹی سے یہاں نفرت ہے۔ لے بس اب تم جاؤ۔ تراب علی ! تم بھی ان کے ساتھ جاؤ"۔ تراب علی بولا "حضور اسی دم توپ کے مہرے پر کھڑے چلا جاؤں۔ میں تو نمک پروردہ

قدیم ہوں۔ غلام کو عذر کیا۔ چلو بھئی جھمن !"

رئیس زادے نے کہا " دیکھو راستے میں کہیں لڑ نہ بیٹھنا دونوں۔ کہیں باہم گلخپ، تکرار، جوتی بیزار ہو تو اصل مطلب ہی غت ربود ہو جائے " کہا اے حضور کیا طاقت۔ اس طرح رہیں جیسے شیر و شکر۔ اس وقت جان نثاری کا موقع ہے۔ یا گلخپ کا۔ لاحول ولاقوت۔ چاہے جان جاتی رہے مگر معاملہ ٹھیک ٹھاک کیے بغیر ملک الموت کو بھی بتے بتائیں گے۔

میاں جھمن اور تراب علی پو قدے چلے تو راستے میں یوں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔

جھمن :- گہرے ہیں استاد گہرے ہیں۔

تراب علی :- اجی ہماری پانچوں گھی میں اور تمہارا سر کڑھائی ہیں۔

جھمن :- اب ایک جگہ بیٹھ کر معاملے کی باتیں تو کرو۔

تراب علی :- اجی تم تو واہی ہو۔ کون بڑا لمبا چوڑا معاملہ ہے۔ چلو ہم کے امین آباد والے ساقی کی دوکان پر دم لگاؤ۔ پھر ہم سب ٹھیک کر دیں گے۔

جھمن :- واللہ کیا کہی ہے۔

تراب علی :- چلو کسی وکیل کے ہاں چلیں کوئی حقیت اعلیٰ کا مقدمہ تو ہے نہیں۔ لاکھ دو لاکھ کی جائداد کا مقدمہ بھی نہیں۔ نہ خون کیا، نہ قتل کر کے آئے ہیں۔ ہم تو جانتے ہیں کہ دس پانچ روپے جرمانہ ہو جائیں گے۔ تراب علی نے کہا، بس اور کیا۔ بلکن (بلکہ) اس سے بھی کم۔ بہت جرمانہ ہو تو آٹھ آنے، ایک روپیہ۔ تدبیر وہ کرو جس سے یاروں کے ہاتھ گرمائیں اور خوب وارے نیارے ہوں۔

تراب علی:۔ ہم جا کے اس کہار کی تو خبر لائیں۔

جھمن:۔ خدا کرے ضرب شدید آئی ہو۔

تراب علی:۔ ہاں مزہ تو جب ہی ہے ورنہ کیا۔ مگر ہم اس کو بھرے دیں گے کہ ابے کچھ تو لے مرا بھی موقع ہے۔

جھمن:۔ تم الگ بہکاؤ میں الگ پٹی پڑھاؤں۔

تراب علی:۔ اجی ہم جانتے ہیں کہ اگر اس مقدمے میں سال سال بھر کے کھانے کو بھی نہ ملا تو کیا۔

جھمن نے کہا "مٹے اور پھر لے اور زیچ گھسٹ لے کیونکہ میاں کی سٹی بٹی بھولی ہے بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔"

(سرشار)

منشی سیّد احمد دہلوی

سیّد احمد ۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حافظ سید عبدالرحمٰن تھا۔ ان کی تعلیم زیادہ تر ان کی ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے۔ یوں تو انگریزی اسکولوں میں پڑھتے رہے، لیکن بالآخر علماء اور شعراء کی صحبت میں اپنی علمی پیاس بجھائی۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، دو کتابوں کی تصنیف پر سرکار انگریزی سے دو سو اور ڈیڑھ سو روپے انعام پایا۔

منشی صاحب کو اُردو زبان سے رُوحانی لگاؤ تھا۔ انھوں نے ۲۲ سال کی عمر سے اُردو لغت کا مسالہ فراہم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران میں مشہور مشرق شناس ڈاکٹر فیلن کی انگریزی اُردو ڈکشنری کی تالیف کا کام سپرد ہوا جسے سات سال میں تمام کیا۔ اور ساتھ ہی اپنی لغت کی کتاب بھی تیار کرتے رہے۔ جس زمانہ میں یہ شملہ ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی تھے. سر آسمان جاہ وزیر اعظم دولت آصفیہ شملہ آئے، منشی صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور لغت کا مسودہ اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مولوی سیّد علی بلگرامی نے اس پر محققانہ نظر ڈال کر اسے پسند فرمایا۔ سرکار نظام سے پانچ ہزار روپیہ نقد انعام ملا اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا۔

منشی صاحب اپنے دَور کے اُردو کے بہترین ادیب تھے، ان کی زبان

بڑی میٹھی اور دل نشین ہے۔ عربی فارسی کے علاوہ، اور بھی کئی زبانیں جانتے تھے تعلیم نسواں کے بھی بڑے حامی تھے۔ ان کی فرہنگ آصفیہ چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ مگر اب یہ کتاب تقریباً نایاب ہے۔ دوسری کتابیں جو آپ نے یادگار چھوڑی ہیں یہ ہیں، تکمیل الکلام۔ تحقیق الکلام۔ قواعد اُردو لغات النساء۔ اخلاق النساء۔ رسوم دہلی۔ سیر شملہ، وغیرہ گورنمنٹ نے انہیں علمی خدمات کے صلہ میں "خان صاحب" کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔

زبان کی تمیز اور اُس کا فرق

زبان تو وہی ایک گوشت کی بوٹی ہے جو دانتوں کی چار دیواری میں تالو کی چھت کے نیچے بل مارتی پھرتی ہے۔ کبھی تو ہونٹوں کے پھاٹک میں درانہ آکھڑی ہوتی ہے، کبھی گردن نکال کر ادھر اُدھر کچھوے کی طرح جھانکنے لگتی ہے کبھی میٹھی چیز کا مزہ لیتی ہے، کبھی کھٹے اور کڑوے سے مُنہ بناتی ہے۔ کوئی اسے لسان کہتا ہے، کوئی جیب، کوئی ٹیل کہتا ہے، کوئی ٹنگ، کسی نے للو کہہ لیا، کسی نے رسنا کہہ لیا، مگر ہماری مُراد اس جگہ روزمرہ کی بول چال یا ہر ایک ملک کی بھاکا سے ہے اس میں خواہ عورتوں کی ہو خواہ مردوں کی۔ گنواروں کی گفتگو ہو یا شہر والوں کی لکھنؤ کی لغت تراشی اور متانت ہو یا دہلی کی سادگی اور سلاست، قلعۂ معلّے کی معاملہ بندی ہو یا ثقات کی لطیفہ گوئی۔ شہدوں کا بھکڑ یا آزادوں کی بدلگامی پیشہ وروں کی اصطلاحیں ہوں یا دلالوں کی رمزیں، بچوں کی اوں اوں اور مم کرنا ہو یا بیگموں کا نت نت اور جم جم کہنا یہ ساری باتیں ہماری اس زبان میں داخل ہیں جس کا ہمیں بیان کرنا منظور ہے۔

۲- عام زبان کسی خاص قوم یا شہر پر مخصوص نہیں ہے۔ یہی زبان ہے کہ جانوروں کے مُنہ میں ہے اور یہی زبان ہے کہ آدمیوں کے دہن میں ہے اگر بلبل اپنے چہکنے سے خوش ہے تو کوّا اپنے کائیں کائیں میں مگن ہے، کوئل کوک کو اچھا جانتی ہے تو مور جھنکارنے کو افضل سمجھتا ہے۔ مینڈک ٹرّانے میں مست ہے تو جھینگر جھیں جھیں میں خوش، پپیہا پی پی سے دل بہلاتا ہے تو فاختہ کو کو سے مگن ہوتی ہے کتا بھونکنے کو خوب سمجھتا ہے تو شیر دہاڑنے کو پسند کرتا ہے اونٹ کو بڑانا بھاتا ہے تو بجار کو ڈکرانا بھلا لگتا ہے، غرض ایک دوسرے کی زبان لہجے کو بحیثیت مجموعی ہم برا نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ ہر ایک کی زبان بجائے خود عمدہ ہے جو کام فصیح آدمی اپنی زبان سے لیتے ہیں وہی کام بھی نکال لیتے ہیں۔ جانور اپنی غیر فصیح زبان سے۔

۳- زبان کیا ہے۔ منشائے دلی کے اظہار کرنے کا آلہ ہے، ایک زمانہ ہوگا کہ ہم لوگ آنکھوں یا ہاتھوں کے اشاروں سے کام لیتے ہوں گے، پھر ایک زمانہ وہ آیا ہوگا کہ ہم نے صرف اسموں سے کام نکالا ہوگا، اب ایک زمانہ یہ ہے کہ ہم نے اسما, افعال روابط وغیرہ کو ملا جلا کر ایک عمدہ تسلسل پیدا کر لیا اور اپنے مفہوم کو اس طرح ادا کرنے لگے کہ سامع کو کسی طرح کی دقت نہ رہی۔

۴- اب اگر ہم طاقتور۔ شہ زور اور کسی جنگل یا پہاڑ کے محنت کش باشندے ہوں گے تو ہمارا ایک ایک لفظ اور ایک ایک کلمہ جرأت، طاقت، سختی، اکڑ پن، غضب درشتی کا جامہ پہنے ہوئے ہوگا حاکم سے بولیں گے تو اکڑ کر ہی بولیں گے۔ اخلاص کی بات بھی کریں گے تو ایسی جیسے پتھر کھینچ مارا اس میں بھی اگر بانگر میں ہماری بود و باش ہوگی تو ہم سب سے زیادہ کرخت الفاظ زبان سے نکالیں گے اور جو کھادر

ہیں تو اس سے دوسرے درجے پر ہمارے الفاظ ہوں گے اور جو ہم دال چپاتی کھانے والے ناز پرودہ عیش منانے والے ہوں گے اور کبھی ریاضت کے پاس نہ پھٹکے ہونگے تو ہماری بات بات سے مسکینی، غربت، عاجزی، سستی اور کاہلی ٹپکے گی۔

۵- اوپر کی بحث سے ثابت ہوا کہ کوئی ملک کوئی ولایت کیوں نہ ہو اس میں دو طرح کی زبان اور دو طرح کے الفاظ ہوں گے بعض الفاظ میں صرف لہجے کا فرق ہوگا۔ بعض میں اصلیت کا اس میں سے ایک زبان اکھڑ اور سخت کے نام سے جیسے گنواری یا جفاکش لوگوں کی بولی کہہ سکتے ہیں مشہور ہو گی)۔ دوسری ملائم اور نرم جیسے شہری زبان کے نام سے موسوم کرنا بیجا نہ ہوگا۔ تعبیر کی جائے گی۔

۶- تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ بارہ بارہ کوس کے فاصلہ پر زبان بدل جاتی ہے مگر خاص شہر میں بھی دو طرح کی زبان ہوتی ہے ایک عام لوگوں کی جسے بعض لوگ زبانِ جہلا یا ادنیٰ آدمیوں کی بولی کہتے ہیں، دوسری خاص لوگوں کی جسے زبان شعراء یا فصحاء سے تعبیر کرتے ہیں، شعراء کی زبان میں بھی اختلاف ہے۔ کوئی عام محاورے پسند کرتا ہے۔ کوئی خاص جیسے اُستاذ ذوق اور حضرت غالب، اب اُن شہروں میں بھی فرق ہے جو شہر کسی بادشاہ کا مدت تک دار الحکومت رہا ہوگا اُس کی زبان اور شہروں کی نسبت عمدہ اور زیادہ شائستہ خیال کی جائے گی اور ہر ایک مصنف یا شاعر یا فصیح اُس شہر کی زبان کو قابلِ سند اور تقلید سمجھ کر وہاں کے باشندوں کی پیروی کرے گا اور جو وہ شہر کسی نواب یا وزیر یا رئیس یا بلچ گوار کی گدی ہوگی تو اُس کا چنداں اعتبار نہیں کیا جائے گا گو وہ شہر کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے، باعتبار زبان تو ہر ایک زبان کا مرتبہ ایک ہی ہے، مگر اس لحاظ سے کہ دار الحکومت میں آکر ہر ایک لفظ

سانچے میں ڈھلتا اور خراد پر چڑھتا ہے اُسے سب پر ترجیح دے سکتے ہیں اس بات کے ثبوت میں ہزاروں دلیلیں موجود ہیں اگر کوئی کشمیر کا رہنے والا ہندوستان کی زبان کو بُرا بتائے یا کوئی ہندی نژاد اصفہان کی زبان کو ٹکسال باہر ٹھیرائے تو کیا کوئی عقلمند اُسے تسلیم کرے گا ؟ نہیں ہرگز نہیں۔

۷- اب رہی یہ بات کہ زبان کی عمدگی کن باتوں پر منحصر ہے سو یہ ہم کیا تمام عالم کُھلے خزانے کہہ رہا ہے کہ زبان کی خوبی اس کی سلاست عام فہمی، نرمی، موزونی چھوٹے چھوٹے الفاظ بڑے بڑے معنے پر موقوف ہے۔ جو لفظ جہاں چسپاں ہو وہیں نگینے کی طرح جڑا ہو بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کی سمجھ میں آجائے سو یہ بات زیادہ تر عورتوں کی زبان میں پائی جاتی ہے اور عورتیں بھی کونسی جو بازاری نہ ہوں، یا اُن لوگوں کی بول چال میں جنھوں نے اپنے ماں باپ کے روزمرہ کو معیوب سمجھ کر اس کے چھوڑ دینے پر مبادرت نہ کی ہو۔ اپنی اصل پر خود بھی قایم رہے ہوں اور زبان کو بھی جوں کا توں بنا رکھا ہو، اگرچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اوروں کی زبان کی حرف گیری کرتے ہیں وہ بھی گھر میں جاکر اپنے بال بچوں کے ساتھ وہ گفتگو نہیں کرتے جو باہر لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں ان کی تحریر میں بھی وہ لفاظی، سجع بندی، قافیہ پیمائی، خود آرائی پائی جاتی ہے کہ جسے سُن کر خواہ مخواہ آدمی کی طبیعت اُلجھے یہی وجہ ہے کہ اُن کی کوئی بات بناوٹ۔ ساختگی، اور آورد سے خالی نہیں ہوتی اور ان کا کلام نرا بے لطف اور بے اثر ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ عربی فارسی کے غیر مستعمل لغت ٹھونس کر بھر دیتے ہیں اگر کوئی عبارت لکھنے بیٹھے تو دس بیس لغت کی کتابیں آگے رکھ لیں اور اپنی بے معنیٰ علمیت جتانے کو بڑے بڑے لفظ چُن کر اس عبارت میں داخل کرتے چلے گئے، اور

اس کا نام زبان علمی رکھ لیا۔ اگر وہ زبان اُردو ہے تو اس کا نام بدنام کرنے کو تھا کی جگہ بود اور ہے کی جگہ است لکھدیا اور اس عبارت کو سر رشتۂ تعلیم کا رہنما سمجھ لیا، عربی لفظوں کو اس طرح بھرا کہ ایک ایک بات کے چار چار مترادف ٹھیرا کر لکھدئے، اُن کی بلا سے کوئی اُن سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے کسی نے اس عبارت کو مجذوب کی بڑ جانا اور کسی نے بلائے جان سمجھا اگر وہ اخبار ہے تو پڑیاں بندھیں اور جو کتاب ہے تو لڑکوں نے پتاخے بنائے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا اب پھر اپنے مطلب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں

۸۔ جس زبان کی خوبی سلاست پر موقوف ہے، اسی طرح اس کی تکمیل ہر قسم کے الفاظ کی دستیابی اور کسی طرح کی روک نہ ہونے پر مخصوص ہے اگر ہم اپنے ملک کے سخت الفاظ سے پرہیز کریں اور ان کو اپنی زبان پر نہ آنے دیں تو سخت کاموں کے واسطے کہاں سے الفاظ لائیں گے اور سخت آلات کا نام کن کن لفظوں سے موزوں کریں گے ایسے لفظوں سے پرہیز کرنا زبان کو آئندہ کی ترقی سے باز رکھتا ہے؛ ہاں غیر زبان کے اُن لفظوں کا استعمال کرنا جو بالکل ہمارے کانوں سے جُدا زبان، سے نا آشنا ہوں کسی طرح کارآمد نہ ہوگا بلکہ اگر وہ الفاظ ہمارے قاعدہ اور لہجے کے موافق ڈھالے جائیں تو بھی پورا پورا مطلب نکالنے پر قادر نہ ہوں گے مگر پچھلی صورت جب تک اپنی زبان سے کوئی لفظ بنایا جائے اور اس کی کامل ترقی ہو کام نکالنے کے لیئے اچھی ہے، پہلی صورت کے مصداق ہمارے ہندوستان کے اسی شہر کے لوگ ہیں جہاں کے نوکر چاکر تک جن کو آٹھ پہر اُن لوگوں سے کام پڑتا ہے، اپنے آقا کی بولی نہیں سمجھ سکتے، اُن کی زبان پر عربی، فارسی، کے وہ الفاظ چڑھے ہوئے ہیں جو شاید ان کے سوا اور لوگ لکھنے میں بھی استعمال نہ کرتے ہوں گے اور وہ بھی لکھتے ہوں گے تو لغت کی کتاب سامنے رکھ کر۔

۹- پرانی زبان کو جو تنزل ہوا ہے۔ اُس کا بڑا سبب یہی ہے کہ غیر مانوس الفاظ کا رواج پانا دوسرے ملک کے ایسے لفظوں کو جن کا ثانی اپنے ملک میں موجود ہو داخلِ زبان کرنا سخت سخت مخارج کے لفظوں کو فخریہ اپنی زبان پر چڑھانا عام لوگوں کی زبان کو پایۂ اعتبار سے گرانا سہل الخروج لفظوں کو خیال میں نہ لانا علیٰ ہٰذالقیاس اور بھی ایسے ہی باعث ہوئے ہیں کہ جہاں کوئی کرخت اور سخت لفظ لوگوں کی زبان سے نہ نکلا یا تو اُس کو بالکل ترک کر دیا کچھ سے کچھ کر لیا اور زبان کے آسان لفظ دیکھ اپنی زبان میں ملائے سخت زبان صرف کتاب ہی میں دھری رہ گئی۔

۱۰- ایک زمانہ وہ تھا کہ تمام ہندوستان میں سنسکرت پھیلی ہوئی تھی، کوئی اِکّا دُکّا ہی ہوگا جو سنسکرت سے آشنا نہ ہوگا، مگر چونکہ اس کے اکثر لفظ بآسانی ادا نہیں ہو سکتے تھے، اُسی زمانہ میں اُس سے ملتی جلتی ایک اور پالی زبان بولی جانے لگی۔ جب اس میں بھی دقّت پیش آئی تو پراکرت کا جھنڈا قائم ہوا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بھاکا اور پھر اُردو زبان کا رواج ہو گیا۔ قدیمی زبان ایسی گم ہوگئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ البتہ سنسکرت کے وہ الفاظ جو ہماری زبان سے آسانی کے ساتھ نکل سکتے تھے آج تک جوں کے توں قائم ہیں اور جو الفاظ اس زمانہ میں پنڈتوں کے سوا اور لوگوں کی زبان سے صاف ادا نہیں ہو سکتے تھے یا تو وہ صرف کتابوں میں ہیں یا اُنھوں نے کوئی اور صورت قبول کر لی ہے یعنی کہیں سے کوئی حرف گرا دیا کہیں کسی حرف کو کسی حرف سے بدل دیا اور اپنا مطلب نکال لیا۔

۱۱- ایک ہی ملک میں ایک زبان کے ہوتے جو دوسری زبان کا رواج ہو جاتا ہے اُس کا سبب بھی یہی ہوتا ہے کہ پہلی زبان اپنی سختی کے باعث ناگوار گذرنے لگتی ہے

دیکھو سنسکرت کے زمانے میں پالی اور پراکرت نے اپنا جھنڈا گاڑ ہی دیا، ژند و پاژند کے وقت میں دری کا نقشہ جم ہی گیا، عبرانی کے وقت میں عربی نکل ہی آئی، اسی طرح ہر ایک زبان میں ہوتا آیا ہے اور اکثر سخت زبانوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

۱۲- اس بیان سے ہماری مراد یہ نہیں کہ غیر زبان کے الفاظ اپنی زبان میں داخل ہی نہ کئے جائیں۔ نہیں اگر ضرورت پڑے تو ضرور داخل کرو، بعض علوم جدیدہ اس قسم کے ہیں کہ ان میں جو اصطلاحیں استعمال میں آتی ہیں وہ ہماری زبان میں موجود نہیں۔ مثلاً علم نباتات و جمادات میں جو اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کے مترادف ہماری زبان میں بہت کم ہیں۔ اسی طرح ریل اور تار کی اکثر اصطلاحیں ایسی ہیں جن کے مترادف نہیں۔ پس بجائے اس کے کہ ہم نئے لفظ تراشنے کی کوشش کریں اگر ان ہی الفاظ کو بجنسہ یا تھوڑے تغیر و تبدل سے اپنی زبان میں داخل کرلیں تو اس کا مضائقہ نہیں۔ سٹیشن۔ لمپ، انجن۔ پنسل۔ انگریزی کے لفظ ہیں، مگر ان کا رواج ایسا عام ہو گیا ہے کہ کانوں کو بُرے معلوم نہیں ہوتے۔ اس قسم کے الفاظ زبان میں داخل کرنے سے اس کی وسعت ہوتی ہے اور اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کا آسان طریق حاصل ہوتا ہے، البتہ اگر کوئی شخص روٹی کی جگہ بریڈ اور پانی کی جگہ واٹر استعمال کرے تو یہ نہ تو کانوں کو اچھا معلوم ہوگا اور نہ زبان کو اس سے وسعت حاصل ہوگی۔

(سید احمد)

مرزا محمد ہادی رسوا

مرزا محمد ہادی رسوا شعر و شاعری میں مرزا اوج لکھنوی کے شاگرد تھے۔ رسوا کا قریب قریب وہی رنگ ہے جو مرزا غالب کا تھا اور کیوں نہ ہو وہ بھی فلسفی تھے اور یہ بھی فلسفہ کے ڈاکٹر (پی۔ایچ ڈی) تھے۔ اور حیدر آباد کے شعبۂ دار الترجم سے منسلک تھے۔ رسوا نثر نگاری میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ ان کا سا صاف، سادہ، دل نشیں، پُرزور اور واضح اندازِ بیان کم لوگوں کو نصیب ہے۔ "اُمراؤ جان آدا" ان کا شاہکار ہے۔ اس میں ایک طوائف کی خود نوشت سوانح عمری پیش کی گئی ہے۔ جیتی جاگتی ہستیوں کو ان کے فطری رنگ روپ میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنی تمام اُمنگوں اور دلچسپیوں کے ساتھ ان کی تصنیف میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کی تصانیف مرقع لیلےٰ مجنوں، نوبہار، امید و بیم، خونِ عاشق، شریف زادہ اور ذاتِ شریف وغیرہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

تعلیم یافتہ کے لیے مفید مشورہ

بعد عا کے معلوم ہو کہ تمہارے بی۔ ایس۔ سی ڈگری کا امتحان پاس کرنے

کا حال معلوم ہوا - اس موقع پر اگر میں خوشی نہ ظاہر کروں تو تم ناخوش ہو گے - اس لیے تمہاری خوشی کے لیے میں نے تمہارے نام کے ساتھ قبل اس کے یونیورسٹی ہال سے تم گون پہنے ہوئے ڈپلوما ہاتھ میں لے کے نکلو لفظ بی - ایس - سی تمہارے القاب میں بڑھا دیا اور خلاف معمول آج تمہارے نام کے پہلے لفظ مرزا بھی لکھا ہے - واقعی اب تم اس قومی اور خاندانی خطاب کے شایاں ہو - میرے نزدیک اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہی شرافت کا تمغہ ہے جس سے میں نامساعدت زمانہ کی وجہ سے محروم رہا - مگر یہ اچھی طرح یاد رکھنا کہ خالی شرافت کا تمغا بھوک پیاس کی تسکین کے لیے کافی نہیں ہے - ہر ایک طبعی حاجت کے لیے طبعی مشقت ضروری ہے - اگر تمہارے لیے کوئی پانی نہ بھرے تو جب پیاس لگے گی تو تم کو ڈول لے کے خود ہی کنویں پہ جانا پڑے گا - اگر کوئی تمہارے لیے روٹی نہ پکائے تو تمہیں خود ہی پکانا پڑے گی - تم ماشاء اللہ خود ہی صاحبِ علم ہو مجھ سے زیادہ اس بات کو سمجھ سکتے ہو کہ جو تحریک جتنی قوت سے ایک مرتبہ ہوئی ویسی ہی تحریک کے لیے اتنی ہی قوت ہمیشہ لازمی ہے - اگر یہ نہ ہوتا تو پھر علم میکانات میں کوئی مقیاس نہ مقرر ہو سکتا اور نہ اس علم کا انضباط ہو سکتا - نظام شمسی اور سیارات سے لے کر ایک قطرۂ آب بلکہ ہر ذرہ اس میکانی قانون کے تابع ہے - وذالک تقدیر العزیز الحکیم ۵ روٹی بغیر محنت کے نہیں مل سکتی - میری مراد جسمانی اور طبعی محنت سے ہے - وہ شغل بیکاری ہے جسے لوگ دماغی محنت کہتے ہیں - میرے نزدیک اس مقصد کے لیے مفید نہیں - ہاں کلوں کی ایجاد سے انسان کو یہ فائدہ ہوا کہ مشقت بدنی میں کفایت

اور بچت ہوگئی - مگر تحریک اور متحرک کی قوتوں میں جو مساوات بھی بعینہٖ باقی ہے - جو کام جس وقت سے ہوتا ہے وہ اب بھی اتنی ہی قوت سے ہوتا ہے۔ کلوں کی ایجاد نے کام کی مقدار کو بڑھادیا - مگر اس سے محض کام کی ضرورت دنیا میں زیادہ ہوگئی - کام سے انسان کو پھر بھی فرصت نہ ملی - جتنی کام کی ضرورت بڑھی کلوں نے اتنی ہی محنت کا بچاؤ کر دیا - اگر معادلت کے دونوں طرف سے یہ دو برابر چیزیں نکال لی جائیں تو پھر بھی انسان کی ذاتی حاجت ایک طرف اور اس کی ذاتی مشقت دوسری طرف باقی رہ جائے گی - یہ ایک ایسی ضروری معادلت ہے جو تا قیامِ قیامت (بلکہ اس کے بعد بھی) باقی رہے گی - اگر ایسا نہ ہوتا تو کلوں کی ایجاد کے بعد نہ کارخانوں میں کاریگر نظر آتے نہ کھیتوں پر کشت کار - مگر روئی کی ضرورت جو سب ضرورتوں سے زیادہ ہے، اس کا حال دیکھو، تمام عالم کی زمین مزروعہ ایک رقبۂ آراضیٔ محدود ہے - انسانوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے - کلوں کی ایجاد نے جتنا محنت کا بچاؤ کر کے پیداوار کو بڑھایا اُتنے ہی کھانے والے بڑھ گئے - کھانے والوں کے بڑھنے سے مانگ زیادہ ہوگئی - قیمت کا بڑھ جانا بعینہٖ محنت کا بڑھ جانا ہے - یہ ضرور ہے کہ مانگ کے بڑھنے سے رسادر بڑھ جاتا ہے اور اس سے قیمت گھٹ جاتی ہے - یہ نسبت ہمیشہ دو خاص ضدوں کے مابین گھٹتی بڑھتی رہے گی - ایک لطیفہ تمہیں سُناتے ہیں -

ہمارے ایک دوست تھے پادری صاحب - تازہ ولایت - ایک دن میں ان کی ملاقات کو گیا - گرمیوں کے دن تھے خس کی ٹٹیاں لگی تھیں - قلی پنکھا کھینچ رہا تھا - اتفاقاً پنکھا قلی کسی کام سے پنکھا چھوڑ کر چلا گیا - سخت گرمی ہوگئی - اس پر کچھ

ذکر چلا۔ پادری صاحب نے فرمایا واقعی بڑا سخت کام ہے۔ دن بھر ہاتھ نہیں رُکتا۔ اگر اب کی بیں ولایت گیا تو اس مقصد کے لیے ایک کل بنوالاؤں گا۔ صاحب نے ایسا ہی کیا۔ پنکھا کھینچنے کی کل ایجاد کی۔ ولایت سے بنوا کر لائے۔ مگر اس سے کیا ہوا؟ محنت کا خرچ تقریباً وہی رہا۔ اِس لیے کہ کئی سو روپیہ صرف کر کے کل تیار ہوئی، پھر ہندوستان میں آنے جانے کا خرچہ اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو وہی ماہواری پڑ جائے گی۔ پنکھا قلی بھی بیکار نہ رہا ہوگا۔ حاجتوں نے اس کو اور کام میں لگا دیا ہوگا۔ خلاصۂ تقریر یہ ہے کہ کلوں کی ایجاد ہونے نے آدمی کو بے کار نہیں کر دیا۔ میری رائے میں بدنی محنت کرنا ہر شخص پر واجب ہے۔ اور واجب بھی کیسا عینی نہ کفائی۔ اس کی ایک مثال لکھتا ہوں جس سے میں خیال کرتا ہوں کہ میرا مطلب تم بخوبی سمجھ جاؤ گے۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ تم اپنے فارم پر ہو اور برسات کا زمانہ قریب ہے۔ مکّا چمار نے اپنا چھپّر باندھا ہے۔ اب وہ اُٹھا کے کچّی دیواروں پر رکھنا چاہتا ہے۔ لوگ چھپّر اُٹھانے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ صرف ایک آدمی کی کمی ہے۔ تم موجود ہو۔ کیا ایسی حالت میں تم اپنی بی۔ ایس سی کی ڈگری کا تفاخر اپنے دماغ میں لیے ہوئے اسٹڈی روم (کتاب دیکھنے کا کمرہ) میں بیٹھے رہو گے اور اُس غریب کے چھپّر اُٹھانے کی تکلیف اپنی شان کے خلاف سمجھو گے؟ مجھے تمہارے اخلاق سے کبھی امید نہیں ہو سکتی۔ اس مثال سے سمجھ لو قومی ضرورتوں کا بار اُٹھانے کے لیے قوت اجتماعی کی ضرورت ہے اور میں کہتا ہوں کہ اس کے لیے ہر شخص کو حصہ رسدی طبعی مشقت کرنا فرض ہے۔ ہر شخص کو کم از کم اتنا کام ضرور کرنا چاہیے جو اُس کی ذاتی حاجتوں کی

مساوات کو پورا کر دے۔ اور اپنی ذاتِ خاص کے لیے اس کو دوسروں کا بار نہ اُٹھانا پڑے ہمارے ملک کے دیہات کا دستور ہے کہ فصل کی تیاری کے وقت کچھ لوگوں کے حقوق فی بیگھا یا فی کھیت دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک حصّہ فقیر کا بھی ہوتا ہے۔ جو لوگ بلا محنت دنیا کی کھیتی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اُن کا حال مثل اُن دیہاتی فقیروں کے ہیں۔ میں اس حق کو کوئی حق نہیں سمجھتا بلکہ یہ ایک قسم کا صدقہ ہے جو اور لوگ اپنی عنایت سے بیکاروں کو دیتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کے قریب کفایت علی شاہ ایسے فقیروں میں سے ہے جس کو ہر فصل پر اناج دیا جاتا ہے۔ مجھے اس کا دینا ہمیشہ کھلتا تھا۔ مگر ایک دن میں خود اس کے تکیے کی طرف نکل گیا۔ اُس دن سے میرا وہ خیال بدل گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی ذات سے آئندو روند کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ خصوصاً بوجھیلوں کو۔ گنوار بھاری بھاری بوجھ اُٹھائے پسینے ٹپکتے ہوئے، دھوپ میں جلتے وہاں آ کر سایہ دار درختوں کے نیچے دم لے کر ٹھنڈی ہوا کھاتے ہیں۔ اُس کنویں سے جو اس کا ذاتی بنوایا ہوا ہے۔ پانی پیتے ہیں مسلمان اسی کے گھڑوں سے اور ہندو خود بھر لیا کرتے ہیں۔ بھٹیک میں آگ رہتی ہے۔ لوگ چلمیں بھر بھر کر پیتے ہیں۔ غرض کہ اصولِ کفایتِ عامہ نے کفایت علی شاہ کو بھی بے کار نہ چھوڑا۔ شہروں میں بہت سے نکمّے عالم، فاضل، مولوی، پادری پنڈت اتنا فائدہ بھی خلق اللہ کو نہیں پہنچاتے۔ نظامِ معاشرت سے اگر ان کو کچھ وصول ہوتا ہے وہ ہرگز ان کا حق نہیں ہے۔ تم کہو گے کہ اخلاقی فائدہ ان سے پہنچتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے۔ مگر اتنا ہی اخلاقی نقصان بھی پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ لوگ ان کی عزّت اور شان و شوکت دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسی قسم کے طریقۂ زندگی

کو پسند کر کے ان کے خلیفہ یا سجادہ نشین بن جاتے ہیں۔ ان کی اولاد اکثر حالتوں میں اپنے آبائی علم وفضل میں جس کی مقدار بہت ہی کم ہے حد سے زیادہ فخر کرتی ہے اور لوگ اس خیال سے کہ ان کو تحصیل علم وفضل کا موروثی ملکہ حاصل تھا اور اس کے اکتساب کا ذریعہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ ضرور ہے کہ یہ لوگ بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ تر عالم وفاضل ہوں۔ ان کی قدر کرتے ہیں اور ان کو بلا محنت جو یہ عزت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی وضع کو ان کی اولاد اختیار کر لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ علم وفضل خاندان سے مفقود ہوتا جاتا ہے اور صرف تفاخر باقی رہ جاتا ہے۔

نئی روشنی والوں میں یہی حال ہے۔ اُن لوگوں کا جو ریفارمر بن بیٹھتے ہیں۔ "خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت" اور اکثر حالتوں میں اسی کو ذریعۂ معاش قرار دے لیتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ تم لا کلاس اٹنڈ کرتے ہو (پڑھتے ہو)۔ میں کسی قسم کی تحصیل علم کو منع نہیں کرتا بلکہ علم قانون کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ جس سلطنت کے ہم تابع ہوں اس کے قانون کا جاننا ہم پر فرض ہے۔ مگر اتنی نصیحت بوڑھے باپ کی اگر مانو گے تو تمہارے لیے بہت مفید ہوگا۔ میری رائے میں ان پیشہ وروں کو روحانی مسرت کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ دنیا کے جھگڑوں سے ایک دم فرصت نہیں ملتی۔ اگرچہ اصل پیشہ وکالت بُرا نہیں مگر بڑی احتیاط کا کام ہے۔ ہمارے شہر میں چند وکیلوں نے جو احتیاط اس باب میں کی ہے وہ ان کا حصہ ہو گیا۔ شاید تم سے نہ نبھ سکے گی۔ غاصب وظالم کی حمایت کرنا ہر مذہب میں ناجائز ہے۔ اور مجھے یہ خوف ہے کہ اس پیشے میں اس کا خیال کمتر رہتا ہے۔ انجینیری اور اس سے بہتر ڈاکٹری ہے۔ اگر یہ تم سے ہو سکے

نوکر دو ورنہ میرے پاس چلے آؤ اور میرے ساتھ ہل جوتو۔ یہ بہت ہی عمدہ کام ہے بڑے لطف سے زندگی کٹتی ہے۔ اطمینان۔ فراغت۔ صحت سب کچھ اسی کام میں ہیں۔ دیہات کی زندگی بسر کرنے کا مزہ اہلِ شہر کیا جانیں۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ مجھے اسی دنیا میں خدا نے بہشت عطا فرمایا ہے۔ اگر تمہیں خدا توفیق دے تو یہی لائف تم بھی اختیار کرو۔ نوکری کے خیال میں نہ پڑو۔ بڑی بڑی ذمہ داریاں اپنے سر پر لے لینا آسان ہیں مگر اس کام کا نباہ مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے بیٹے جی تم ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ آؤ چند روز کی زندگی ایک نیک کام میں صرف کریں۔ یہ یاد رکھو کہ ایک نہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب علوم ملکی زبان میں سکھائے جائیں گے۔ اگرچہ فی زمانہ بعض عقلاء نے اس امر سے اختلاف کیا تھا کہ ہماری زبان یعنی اُردو علمی ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا تعلیم علوم انگریزی زبان میں ہونا چاہیے۔ تو یہ اختلاف محض موجودہ ضرورتوں کے اعتبار سے تھا۔ اس مایوسی کی وجہ سے جو اُردو کی کم مائگی پر نظر کر کے پیدا ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں کوشش کیے بغیر مایوس ہو جانا ٹھیک نہیں ع

ایں فتوےِ ہمّت بود اربابِ ہمم را

(مرزا محمد ہادی رسوا)

مولانا عبدالحلیم شرر

آپ ۱۸۶۰ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ان کے والد تفضل حسین اپنے زمانے کے اچھے طبیب اور عربی فارسی کے فاضل تھے۔ شرر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے اور بعد ازاں مٹیا برج کلکتہ اور دہلی کے اساتذہ سے پائی معقولات، ادب اور منطق کی کتابیں پڑھیں لیکن طبی تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ انگریزی زبان بھی سیکھ لی تھی اور فرانسیسی زبان سے بھی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اخباری دنیا میں مولانا نے اسی زمانہ میں قدم رکھا۔ اور اپنے دور کے سب سے مشہور اخبار "اودھ اخبار" لکھنؤ سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔

مولانا شرر نے بیس سال کی عمر سے باقاعدہ اخبارات میں مضامین لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ بہت جلد ان کے خاص ڈھنگ کے مضامین پسند کئے جانے لگے۔ دو سال بعد "اودھ اخبار" سے قطع تعلق کر کے مولانا نے ناول نگاری شروع کر دی۔ آپ کا سب سے پہلا ناول "دلچسپ" تھا جو ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اس کے پانچ سال بعد اپنا مشہور رسالہ "دلگداز" جاری کیا جس میں قسط وار ناولوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جو ختم ہو جانے پر کتابی شکل میں شائع کر دیئے جاتے تھے۔

مولانا نے بہ سلسلۂ ملازمت حیدرآباد کے دو سفر کئے۔ حتیٰ کہ نواب

وقار الامرا کے صاحبزادے کے اتالیق بنا کر انگلستان بھیجے گئے۔ اس کے بعد مستقلاً لکھنؤ میں قیام فرمایا اور اخیر عمر تک ناول نگاری و تاریخ نگاری میں مصروف رہے۔ ۱۹۱۶ء میں وفات پائی۔

آپ اُردو کے مشہور ناول نویس اور مؤرخ ہیں۔ جدید طرز کے ناولوں کی بنیاد آپ ہی کے ہاتھوں پڑی۔ ان کے ناول زیادہ تر تاریخی ہیں۔ اُردو داں طبقہ میں تاریخ بینی کا ذوق شوق ان ہی ناولوں نے پیدا کیا۔ آپ کی تصانیف بکثرت ہیں جن میں سے "یوسف نجمہ" "ملک العزیز ورجنا" "فردوس بریں" "ایام عرب اور تاریخ سندھ" وغیرہ خاص امتیازی درجہ رکھتی ہیں۔ مختلف مضامین کا مجموعہ آٹھ جلدوں میں الگ شائع ہوا ہے۔

مولانا اُردو میں اس نئے رنگ کے بانیوں میں سے ہیں جو آج عام طور پر اخباری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ مولانا کی نثر خیال آفرینی، دل چسپی اور منظر کشی کے اعتبار سے ایک بلند حیثیت کی مالک ہے۔

عمرِ رفتہ

نہ بھول اس زندگی پہ غافل نہیں ہے کچھ اعتبار اس کا
کہ راہ لے گی یہ اپنی اِک دن عدم کا رستہ تجھے بتا کر

ایک بڈھا بسترِ غم پر لیٹا ہوا دم واپسیں کا انتظار کر رہا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہے۔ فرشتہ اجل کی مہیب صورت اس کی آنکھوں کے آگے ہے۔ عالمِ ہستی کی دل بستگیوں پر نگاہ ڈال رہا ہے۔ دل میں امیدوں کی آس اٹھتی ہے اور رہ جاتی ہے



مولانا عبدالحلیم شرر

اردو میں تاریخی ناول نویسی کے موجد

آرزوؤں کو مایوسیاں خاک میں ملادیتی ہیں۔ تمناؤں پر ناامیدیوں کی اوس پڑ رہی ہے، بس یہ حال ہے کہ صورتِ یاس بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ موت کے اشتیاق میں پہلو بدل رہا ہے۔ کروٹیں بدلتے بدلتے آنکھ لگ گئی۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک بچے نے آتے ہی اُس کا دامن پکڑ لیا۔ اگرچہ بچے کی صورت پر شگفتگی اور خندہ جبینی قربان ہوئی جاتی ہے۔ مگر کچھ عجب بے ساختگی اور ہٹ کے ساتھ مچل مچل کر وہ کہہ رہا ہے کہ "تو نے میری کچھ قدر نہ کی۔ خدا نے تجھے میری سرپرستی پر مقرر کیا تھا۔ تو نے مجھے لے کے ستیاناس کر دیا۔ دیکھ تو سہی قیامت کے روز تجھ سے کیسا بدلہ لیتا ہوں۔" بڈھے نے کہا "آخر تو کون ہے مجھے تیری صورت یاد نہیں پڑتی۔" وہ بچہ کہنے لگا "افسوس تو مجھ کو ایسا بھول گیا؟ میں تیرا بچپن ہوں جسے تو نے کھیل کود کر گذار دیا۔" بڈھا بے تحاشا چاہتا تھا کہ اس بچے کو گود میں اُٹھالے کہ اس نے دامن جھٹک کر کہا "خبردار! ایسا کبھی نہ کرنا۔ اب تو مجھے کبھی نہ پائیگا۔" اس بچّے نے کچھ ایسا جھٹکا دیا تھا کہ بڈھا چونک پڑا اور اپنے بچپن کی آزادمنشی کا زمانہ یاد کر کے سراسیمہ و مضطر ہونے لگا۔ اُس بے غمی اور بے فکری کے عالم کا خیال کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ عہدِ طفلی کی ساری بے باکانہ خودپسندیاں اس کی آنکھوں کے آگے پھر گئیں۔ وہ بے فکریاں وہ خودآرائیاں وہ ذراسی چیز پر خوش ہوجانا وہ ذراسی بات پر رو دینا، وہ تلوّن مزاجی، وہ فوری غم، اور فوری خوشی، وہ انتہائی ضد وہ بلا کی ہٹ، وہ کسی کی بات کا نہ ماننا، وہ کسی کے کہنے میں نہ ہونا، وہ کسی کو کچھ نہ سمجھنا، وہ دوڑنے دھوپنے کا دلولہ، وہ سیر وہ تماشے کا شوق، وہ کھیل کود میں لگا رہنا، وہ دو گھڑی کے ہنسی ٹھٹھے میں سارا غم غلط کر دینا، وہ ماں باپ کی دل دہی،

وہ اپنی بے رخی، وہ استاد کی مار، وہ چھٹی کا انتظار، وہ قمچیوں پر قمچیاں کھانا، وہ سبق کا بھول بھول جانا، وہ جمعہ کا روز، وہ ہمجنسوں کا جتھا، سب کا خیال گذر گیا افسوس کہہ کر ابھی اچھی طرح چپ بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے اس کے ساتھ اپنے ماں باپ بھی یاد آ گئے۔ اُن کی نظر محبت، اور اُن کے دستِ شفقت، ایک ذرا پنڈا پھیکا ہو جانے پر اُن کی بے چینی اور گھبراہٹ، تیز دوڑنے پر اُن کا ہاں ہاں کرنا، شوخی اور شرارت پر دھمکانا، گھڑی گھڑی مولوی صاحب سے کہہ دینے سے ڈرانا، بار بار سمجھانا، پکڑ پکڑ کے بٹھلانا، سب باتیں آنکھوں کے آگے پھرنے لگیں۔ بڈھا جوش میں آ کر چلا اُٹھا "ہائے میرے گذرے ہوئے بچپن کی عمر! میں اب تجھے نہیں پا سکتا۔ جب تک تو میرے پاس تھی میں تیری قدر نہ کر سکا۔ ہائے میں نے تجھے ناقدری میں کھو دیا۔ کاش کچھ تو پڑھ لکھ لیا ہوتا۔" اتنا کہہ کر ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ یہ پُرحسرت جملہ کہتا تھا "ہائے میرے ننھے سے سِن میں اب تجھے پا نہیں سکتا۔" اور روتا جاتا تھا۔ روتے روتے پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اب دیکھتا کیا ہے کہ ایک نہایت خوب صورت جوان کھڑا کہہ رہا ہے۔ "او بڈھے! تو بڑا ظالم ہے مجھے خدا نے تیری ماتحتی میں دیا تھا کہ تو مجھ سا قوتِ بازو پا کر دنیا میں کچھ ملک اور قوم کی اور کچھ اس کی خدمت گزاری کرے، افسوس تو نے کچھ نہ کیا اور مجھ پر بڑا ظلم کیا! تیری ضعیفی پر ترس آتا ہے۔ اب کیا بدلہ لوں؟" بڈھا کہنے لگا "میں نے تجھے کیا تکلیف دی۔ کیوں اس پیرانہ سالی میں ستاتا ہے تو ہے کون؟" جوان برافروختہ ہو کر بولا "ہائے تو مجھے بھول بھی گیا جب خدا کے آگے تیری فریاد لے جاؤں گا تب میں تجھے یاد آؤں گا۔ میں تیرا شباب ہوں جسے تو نے بالکل خواب

غفلت اور رندانہ مشربی میں ہاتھ سے کھو دیا"۔ بڈھا شوق میں آکر چاہتا تھا کہ اُس سے لپٹ جائے۔ مگر اُس نے یہ جملہ کہا" اب میں تیرے ہاتھ ہرگز ہرگز نہیں لگ سکتا"۔ اور زور سے دھکیل دیا کہ بڈھا مُنہ کے بل گر پڑا۔ اور بدحواسی سے اس زور سے چلایا کہ آنکھ کھل گئی۔ چونکتے ہی اسے اپنے شباب کا زمانہ یاد آگیا۔ جس میں وہ بازیچۂ اطفال سے نکل کر سرحد جوانی میں آیا تھا۔ پہلے وہ اس زمانے کا غرور اور کسی کو نہ سمجھنا یاد کر کے بہت رویا۔ پھر شباب کے جنوں خیز ولولوں پر غور کرنے لگا۔ اس زمانے کی شرارتوں کی تصویر بھی اس کے آگے ہو گئی۔ اور وہ سارا جوشِ شباب نظروں میں پھر گیا۔ وہ پُر آزردہ دل، کبر و نخوت سے بھرا ہوا دماغ، وہ بے چین طبیعت، وہ چُلبلا مزاج، وہ آشفتہ مستی، وہ قہقہے، وہ چہچہے، وہ خودسری، وہ کسی کی نہ سُننا، وہ اپنی ہی کرنا، وہ جوانی کی اُمنگ، وہ صحرا نوردی کی ترنگ، وہ بادیہ پیمائی کا ولولہ، وہ بڑھا ہوا حوصلہ، وہ زاہدوں پر پھبتیاں اور واعظوں کا خاکہ، وہ دریا پر ڈٹا رہنا، وہ رات رات بھر مے خانوں کے سامنے پڑا رہنا۔

غرض سب جوانی کی کیفیتیں سامنے ہو گئیں۔ بے چین ہو کر پھر چیخنے لگا۔ ابھی دو چار آہیں نہ کھینچی ہوں گی کہ اُسے ان مجلسوں کا خیال گذرا۔ جہاں واعظ اور ناصح ممبر پر بیٹھ کے اچھی باتیں بتلایا کرتے تھے اور وہ الگ ہی الگ کترا کر نکل جاتا تھا۔ اس وقت واعظ کا فوٹو اس کی آنکھوں کے آگے تھا۔ وہ مقدس صورت، وہ نورانی چہرہ، وہ دستارِ فضیلت، وہ لمبی ڈاڑھی، وہ نیچا کُرتہ، وہ اونچا پاجامہ، وہ سیدھی وضع، وہ سادی پوشاک، وہ دل دہی کر کے سمجھانا، وہ نرم ملائم آواز سے خطاب فرمانا، وہ آیتوں کی تفسیر کرنا، وہ احادیث کا مطلب کہنا، وہ جنت کی ترغیب،

وہ حوروں کی چشمِ غزالیں کا نقشہ کھینچتا، وہ ان کی وفاداری اور اطاعت کا چربہ اُتارتا، وہ شرابِ طہور کا شوق دلاتا، وہ عسلِ مصفّٰے کے بیان پر چٹخارہ لیاں بھرتا، وہ دوزخ سے ڈراتا، وہ وہاں کے فرشتوں کی بے رحمی کا حال سُناتا، وہ آتشِ دوزخ کے شعلوں پر کانپ اُٹھتا وہ دوزخیوں کے عذاب پر اُبکائیاں لینے لگتا۔ وہ دُنیا کے جادو نگاہوں کی مذمت، وہ رندوں کی فضیحت، وہ بار بار سمجھاتا، اور وہ اپنا اس کان سے سُننا اور اُس کان سے اُڑا دینا" سب دھیان میں آ گیا۔ کہا " ہزار افسوس ان باتوں پر اس وقت میں نے کیوں نہ خیال کیا۔ ہائے میں نے اپنی ساری کام کی عمر نالائقی اور ہرزہ گردی میں صرف کر دی۔ اے میری جوانی کی عمر! کیا میں تجھ کو پھر کبھی پا سکتا ہوں؟ افسوس جوانی! میں نے تجھ کو بالکل غارت کر دیا میں ان دونوں کو خدا کے آگے کیا جواب دوں گا؟" اس کے بعد وہ اپنی طرف آپ مخاطب ہو کر چلا آیا۔" اے کمبخت بڈھے! تو بڑا نالایق ہے۔ قیامت کے دن تیرا کہیں پتہ نہ لگے گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر چلّا چلّا کر رونے لگا......"

عبدالحلیم شرر

مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی

مولوی صاحب پانی پت کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار حاجی فرید الدین، مرزا بو علی شاہ قلندر کے متولی تھے۔ مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی۔ پھر لاہور پہنچ کر مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے عربی ادب اور مفتی عبداللہ ٹونکی سے مروجہ علوم کی تکمیل۔ انگریزی میں انٹرنس اور فارسی میں منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں بہاولپور کے صیغہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد رام پور ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے۔ مگر یہ سلسلہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ اپنے قدردان اور مربی جنرل عظیم الدین خاں کے حادثہ قتل پر وہاں سے قطع تعلق کر کے پانی پت واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد خواجہ حالی کی وساطت سے سرسید کے لٹریری سکریٹری بن گئے۔ سرسید کے انتقال پر آپ نے معارف نام کا رسالہ نکالا۔ لیکن نواب محسن الملک کے اصرار پر علی گڑھ گزٹ کی ادارت قبول کی۔ مگر علالت کی بنا پر اسے بھی ترک کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد مسلم گزٹ لکھنؤ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے گو یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی۔ اس کے بعد اخبار زمیندار کے چیف ایڈیٹر بنے لیکن اخبار کی ضمانت ضبط ہو جانے پر یہاں سے بھی ہٹنا پڑا۔

لاہور سے مولوی صاحب حیدر آباد کے دار الترجمہ میں پہنچے۔ اور

وہیں آپ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "وضع اصطلاحات" لکھی۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ تو پہلے آپ اسسٹنٹ اردو پروفیسر اور چار سال بعد پروفیسر مقرر ہوئے اور مرتے دم تک اس عہدے پر فائز رہے۔

مولوی صاحب نے اُردو زبان کو وسعت دینے کے لئے دنیا کی دوسری مشرقی اور مغربی زبانوں پر بھی گہری نظر ڈالی۔ پھر آہستہ آہستہ نئی نئی اصطلاحیں، لفظی ترکیبیں اور جدید مشتقات اپنے مضامین کے ذریعے نہایت خاموشی سے پھیلائے۔ ادبی دنیا کو مدت تک اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔ تنقید و مخالفت کون کرتا۔ آخر آپ نے اِس طلسم کو جب توڑا تو اچھے اچھے اہلِ قلم منہ دیکھتے رہ گئے کیونکہ بعض نے تو مولوی صاحب کے طبع زاد الفاظ کو نادانستہ برتنا شروع کر دیا تھا۔

مولوی صاحب کا طرزِ تحریر مولانا حالی کی طرح سادہ، عام فہم، جاندار اور شیریں ہے۔

تلمیحات

الفاظ کیا ہیں؟

وہ آوازیں ہیں جن سے ہم اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں، یا ان کے ذریعہ سے اشیا کی طرف اشارہ کرتے ہیں، دنیا کی جن وحشی قوموں میں الفاظ نہیں ہیں وہ اپنے خیالات یا اشیا کے بتانے کے لئے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں

سے اشارہ کرتے ہیں۔ اگر اظہارِ خیالات کے وقت تم ان کو دیکھو، تو سخت حیرت ہوگی کہ وہ کیسی کیسی عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ اور ان کو اپنے دل کی بات بتانے میں کتنی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جب عقل انسانی نے ترقی کی اور الفاظ ایجاد ہوئے تو یہ دقتیں دور ہو گئیں ایک خاص آواز سے ایک خاص خیال یا چیز یا کام کی طرف اشارہ ہونے لگا۔ اور ہر شخص اس اشارہ کو سمجھنے لگا۔ ترقی انسانی کا یہ دور نہایت اہم تھا جس میں زبان کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

تلمیح اور اصطلاح سے کیا مراد ہے؟

زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لئے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا۔ لمبے لمبے قصوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص لفظوں کے ذریعہ سے اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے فوراً وہ قصے یا واقعے آنکھوں کے سامنے آگئے۔ جن کی طرف وہ اشارہ کرتے تھے۔ ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے پھر علمی مسئلوں یا اصولوں کے بتانے کے لئے بھی خاص خاص الفاظ معین کئے گئے ان میں ہر لفظ اصطلاح کہلاتا ہے۔

دنیا کی جو زبانیں ترقی یافتہ ہیں۔ ان میں تلمیحیں اور اصطلاحیں کثرت سے ہیں تلمیحوں اور اصطلاحوں کی فرہنگیں الگ الگ تیار کی گئیں ہیں جن میں ہر تلمیح اور ہر اصطلاح کی تشریح کی گئی ہے۔ طویل قصوں اور کہانیوں اور علمی مسئلوں اور اصولوں کے بار بار بیان کرنے میں جو وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ اس سے اِن تلمیحوں اور اصطلاحوں نے بچا دیا ہے۔ جو حضرات اصطلاحیں وضع

کرنے کے وقت اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر اصطلاحی لفظ سے پورا مفہوم ادا ہونا چاہیئے۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ دنیا میں کوئی اصطلاح ایسی نہیں ہے جس سے پورا مفہوم ادا ہوتا ہو اور وہ پورا علمی مسئلہ یا اصول سمجھ میں آتا ہو۔ جس کے لئے وہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ یہ حضرات ترقی زبان کے رستے سے پیچھے ہٹنا چاہتے ہیں۔ اور اس منزل کی طرف پھر جانا چاہتے ہیں جہاں پورے علمی مسئلے یا اصول کو بار بار دھرانے کی ضرورت پیش آتی تھی اور ہر دفعہ ایسا کرنے میں بے انتہا وقت ضائع کرنا پڑتا تھا تضیع اوقات ہی سے بچنے کے لئے یہ اشارے ایجاد کئے گئے ہیں۔ جن کا نام اصطلاحات ہے اور یہ اس وقت کی ایجاد ہے جبکہ انسانی عقل کی ترقی کے ساتھ زبان بھی ترقی کی بلندی پر پہنچ گئی تھی۔

جو حال اصطلاحوں کا ہے وہی تلمیحوں کا، طوفانِ نوحؑ کہتے ہی وہ تمام طوفانی واقعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ جو حضرت نوحؑ کے زمانے میں آئے تھے۔ صورِ اسرافیلؑ کا لفظ زبان پر لاتے ہی وہ تمام ہیبت انگیز واقعات دل میں پھرنے لگتے ہیں۔ جو آغاز قیامت کے وقت پیش آئیں گے۔ ان میں سے پہلا اشارہ گزرے ہوئے واقعات کے ایک خوفناک منظر کو یاد دلاتا ہے۔ دوسرا اشارہ آنے والے واقعات کے پُرہول نظارہ کو آنکھوں کے سامنے لاتا ہے، ان اشاروں کے لئے جو الفاظ مقرر کئے گئے ہیں، وہ کسی طرح گذشتہ اور آیندہ واقعات کا پورا مفہوم ادا نہیں کر سکتے۔

بلاغت کے معنی یہ ہیں کہ کم سے کم الفاظ سے زیادہ معنی سمجھے جائیں۔

یہ بات جس قدر تلمیحات میں پائی جاتی ہے۔ الفاظ کی دیگر اقسام میں نہیں پائی جاتی۔ جس زبان میں تلمیحات کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں، وہ بلاغت کے درجے سے گری ہوئی ہے۔ ایسی زبان میں بولنے والوں، لکھنے والوں اور شعر کہنے والوں کو اپنے مطالب ادا کرنے میں بہت زیادہ دقت ضائع کرنا پڑتا ہے، سننے والے ایک ہی واقعہ کو بار بار سننے سے اُکتا جاتے ہیں۔ اگر وہ واقعہ ایک مختصر لفظ سے تعبیر کیا جائے تو اس کا دُہرانا اجیرن نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔ ضمیر اسم کی قائم مقام ہوتی ہے۔ وہ اسی لئے وضع کی گئی ہے۔ کہ بار بار کسی اسم کو دُہرانا نہ پڑے۔ اور سننے والوں کو ناگوار نہ ہو۔ تلمیحات کو اور تلمیحات کے ساتھ اصطلاحات کو بھی قدرتی ضرورت سمجھ۔

تلمیحات سے ہم کیا جان سکتے ہیں:۔

اگر کسی زبان کی تلمیحات کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ تو ان سے اس زبان کے بولنے والوں کے گذشتہ واقعات اور تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے مذہبی عقائد، ان کے اوہام، ان کے معاشرتی حالات اور ان کی رسوم اور مشاغل معلوم ہوتے ہیں۔ کسی قوم نے جس طرح تمدنی منزلیں رفتہ رفتہ طے کی ہیں اور جو تبدیلیاں اس کی زندگی میں یکے بعد دیگرے ہوتی رہی ہیں اس کی زبان کی تلمیحات کے مطالعہ سے سب نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جرمنوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے آباؤ اجداد کن اوہام وخرافات پر ایمان رکھتے تھے۔ پھر ان کے مذہبی خیالات میں کیا تبدیلی ہوئی۔ کون سے اہم تاریخی واقعات انھیں پیش آئے۔ ان کے اسلاف میں

کون کون اشخاص مشہور ہوئے اور وہ کن کن حالات و اوصاف سے متصف تھے تو آپ جرمن۔ فرانسیسی یا انگریزی زبان کی کسی ایسی فرہنگ کو اٹھا لیجئے جس میں اُس زبان کی تلمیحات درج کی گئی ہیں۔ ایک سرسری نظر اس فرہنگ پر ڈالنے سے آپ پر سب کچھ منکشف ہو جائیگا۔

فرضی قصّوں میں جن اشخاص کے خاص اوصاف کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ آج کل ان سے بھی تلمیح کا کام لیا جاتا ہے۔ جب کوئی انشاپرداز شاعر کسی ایسے شخص کا ذکر اپنی انشاء یا نظم میں کرتا ہے جس کے صفات اور حالات قصّے کے کسی مشہور شخص سے ملتے جلتے ہوں تو وہ اپنے شخص کو اس سے تشبیہ دینا کافی سمجھتا ہے۔ نظم و انشاء کے پڑھنے والے اس تشبیہ سے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ شخص مذکور میں کونسی صفات اور کونسے حالات پائے جاتے ہیں۔ فرضی قصّوں کی تلمیحات سے اس قوم کے انشاپردازوں کی قوت تخیّل کا سراغ ملتا ہے جس زبان میں اس قسم کی تلمیحوں سے کام لیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی، انسانی اخلاق اور انسانی معاشرت کے اس قدر پہلو ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ہر پہلو کے لئے ایک نمونہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فلاں انسان اس قسم کی زندگی بسر کرتا ہے۔ فلاں آدمی میں اس قسم کے اخلاق موجود ہیں۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہماری گذشتہ تاریخ میں بھی کوئی نمونہ ایسا موجود ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس خاص نمونے کے انسان کی صحیح تصویر قصّے کے پیرایہ میں کھینچیں۔ پھر دیگر مصنّفین جب اسی نمونے کے اشخاص کا ذکر کریں تو اس قصّے کے نمونے کو تلمیح بنا کر کام لیں۔ شائستہ اور ترقی یافتہ قوموں کے انشاپردازوں

نے اسی ضرورت سے خاص خاص طریقۂ زندگی اور خاص اخلاق کے انسانوں کی تصویریں قصّے کے پیرائے میں کھینچی ہیں۔ اور قوتِ تخیّل سے کام لے کر مکمّل نمونے خاص خاص اخلاق اور خاص خاص صفات و حالات کے تیار کر دیے ہیں۔ پھر بعد کے مصنّفین نے ان نمونوں سے تلمیحات کا کام لیا ہے۔

امریکہ کا مشہور انشاء پرداز آسٹورن لکھتا ہے۔ وہ تلمیحات کیا ہیں؟ ہماری قوم کے قدموں کے نشان ہیں جن پر پیچھے ہٹ کر ہم اپنے باپ دادا کے خیالات، مزعومات، اوہام، رسم و رواج اور واقعات و حالات کے سُراغ لگا سکتے ہیں۔

فرانس کا نامور مضمون نگار شوٹی کران تحریر کرتا ہے کہ "جب میں کسی فصیح البیان شخص کی زبان سے انقلاب فرانس کا لفظ سنتا ہوں۔ تو میرا دل ان وحشت خیز اور دہشت انگیز حالات سے بھر جاتا ہے۔ جن کے سبب دریائے سین کی وادیاں خون سے لبریز ہو چکی ہیں۔ مگر اس کے بعد فوراً میرے خیال کا رُخ اس شاندار جمہوریت کی طرف پھر جاتا ہے۔ جس کی بنیاد ان خون سے بھری ہوئی وادیوں میں اُٹھائی گئی ہے۔"

(وحیدالدین سلیم پانی پتی)

سید ناصر نذیر فراقؔ دہلوی

خواجہ ناصر نذیر ۱۸۶۵ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ خواجہ میر دردؔ کے نواسے تھے۔ عربی، فارسی کی تکمیل کے بعد علم طب میں بھی خاصی مہارت پیدا کی اور رئیس دھرم پور ضلع بلند شہر کے طبیب خاص مقرر ہو گئے۔

رئیس کا جب انتقال ہو گیا تو آپ علی گڑھ کالج کے نمایندے کی حیثیت سے کچھ عرصہ تک بمبئی۔ بڑودہ اور احمد آباد وغیرہ مقامات میں دورہ کرتے رہے اس کے بعد اپنے وطن مالوف میں آکر خانہ نشین ہو گئے اور وہیں ۱۹۳۳ء میں انتقال فرمایا۔

خواجہ صاحب کی زبان میں موج کوثر کی سی مٹھاس ہے۔ ان کی محاورہ بندی اور روزمرہ، شربت کا ایسا گھونٹ ہے جس کے پڑھنے سے دل کو فرحت پہنچتی ہے۔

خواجہ صاحب کہانیاں سُناتے ہیں۔ وہ بھی سُنی سُنائی نہیں بلکہ آپ بیتی، اور اس کے لئے زیادہ تر مسالا لال قلعہ ہی کے اڑوس پڑوس سے لائے ہیں۔ دلی کا آخری دیدار بیگموں کی چھیڑ چھاڑ۔ ہمارے دعوے کی دلیل ہیں۔ دکن کی پری بھی کہنے کو تو دکن کی پری ہے ورنہ پڑھنے والے کو تو یہ بھی دہلی ہی کے آخری دور کی ایک جھلک دکھاتی ہے۔ غرض ان کی کہانیاں بڑی پیاری بڑی میٹھی اور سبق آموز ہیں:۔

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ

ایک بیوی کالے محل سے مہمان آئی تھیں۔ ان کا نام تھا حضرت بیگم۔ وہ بڑی اکھل کھری اور مزاج کی کڑوی تھیں حسن جہاں کی باتیں سن سن کر بہت گھٹتی تھیں اور بیٹھی کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کرتی تھیں) بی دولتی اپنے تہیے میں آپ ہی آپ کھولتیں، کھانا پینا، چھالیہ، زردہ، الائچی، چٹنی، اچار، مربہ، مٹھائی، ناشتہ سب کچھ حسن جہاں کے تحت میں تھا۔ (سچ مچ خالہ جان نے انھیں کل کلاں کا مالک بنا رکھا تھا) اس مارے بعض بے وقوفیں ان سے اور کھسیانی تھیں۔ ایک دن حضرت بیگم اور حسن جہاں میں مچبنیہ ہو گیا۔ حضرت بیگم کے دل میں حسن جہاں بیگم کی طرف سے ناحق کا بخار تو بھرا ہی ہوا تھا، انھیں دیکھ کر ایک بیوی سے کہنے لگیں "اے بوا! رضیہ سلطان! سنتی بھی ہو؟ قلعہ کی بیگمیں بلی کو نکمی کہا کرتی تھیں۔ یہ چھوٹی ناک بھی کیا بری معلوم ہوتی ہے۔ کمبخت پتیا پھرا ہوا، اور بہن مجھے تو زیادہ گوری رنگت سے بھی نفرت ہے، جیسے پھیکا شلجم!"

حسن جہاں کی ناک بھی چھوٹی تھی اور رنگ بھی ان کا پھیکا پڑتا تھا، سمجھ گئیں کہ پھبتی مجھی پر ڈھالی گئی ہے۔ وہ بھلا کب چوکنے والی تھیں! کہنے لگیں "پھیکا شلجم تمباکو کے بنڈے سے تو ہر طرح اچھا ہے۔ اور مجھے بڑی ناک دیکھ کر گھن آتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے سِل کا بٹہ کسی نے چہرے پر دھر دیا ہے۔ اونچی ناک سوجھے کیا خاک۔ چھوٹی ناک سہاگ کا بیڑا، اونچی ناک کو لاؤ چھرا۔ یہ مثل تو تم نے سنی ہوگی۔" حضرت بیگم کی رنگت بھی کالی بھٹ تھی اور ناک بھی ان کی بڑی اور بے ڈول تھی۔ حسن جہاں کے اس کہنے پر سب بیویاں، بیگمیں ہنس پڑیں اور بی حضرت بیگم بگڑ گئیں۔ ہنسی میں کھسی ہو گئی اور

بی حسن جہاں کی ادران کی خوب دنگو دنگ ہوئی۔

حضرت بیگم "موئی لکھنو کی ٹھیکری، کنجری، کنجنی، پوربنی، ارہر کی دال اور خشکہ کھانے والی ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتی ہے۔ لو اور سنو"

حسن جہاں "میں پوربنی ہوں تو تم پنجابن ہو۔ لکھنو والے ارہر کی دال کے ساتھ خشکہ کھاتے ہیں تو پنجابیوں کو او جھری نصیب ہوتی ہے آئی تھی کہیں کی دتی بلی اجڑی بچڑی"

حضرت بیگم "بس بی! ابس نے کہہ دیا ہے۔ دتی کا نام ذرا منہ سنبھال کر لینا۔ دتی بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے۔ اجڑیں اس کے دشمن وہ کیوں اجڑنے لگی تھی۔ وہ تو اب بھی لعلوں کی لعل ہے۔ ہاتھی لٹے گا بھی تو سوا لاکھ کا کہلائے گا۔ تمہارے بے ڈھنگے لکھنؤ سے اجڑی بچڑی بھی ہزار درجہ اچھی ہے۔ تمہیں خبر نہیں بادشاہ سلامت سات سمندر لانگھ کر دتی تشریف لائے اور بادشاہ بیگم کو بھی ساتھ لائے۔ تخت پر بیٹھے دربار کیا۔ انعام دئے۔ سدھارتے وقت دتی کو سارے ہندوستان کا سرتاج بنا گئے اور پھر سے بسنے کا حکم دے گئے۔ جلنے والے جلے۔ درانداز یاں کر کے چلے، دل کے پھپھولے بھی پھوڑے مگر ایک بھی نہ چلی۔ دیکھنا کوئی دن میں کیسی کینچلی جھاڑتی ہے۔ اور کیا بہار آتی ہے۔ دُلہن بنے گی۔ دشمن بیری انگاروں پر لوٹیں گے"

حسن جہاں "میں نے آپ کی بات کا جواب دیا تھا۔ نہیں تو میں خود دتی پر جان دیتی ہوں۔ کیونکہ میری ننھیال ہے۔ دوسرے حضرت شاہ مردان کی درگاہ اسی میں ہے۔ آنکھوں سکھ، کلیجے ٹھنڈک، دتی جم جم بسے اور جلنے والے ملیامیٹ ہوں۔

اس بجھم بجھا کو سن کر خالہ جان دوڑی ہوئی آئیں۔ اور حضرت بیگم کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں "بہن اسے چھوکری کون کہے؟ یہ تو اچھی خاصی سانڈ ہے۔ اللہ اکبر،

قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔ حسن جہاں نے کہا "خیر سانڈ کمبخت کالی بھینس سے تو اچھا ہوتا ہے۔" خالہ جان نے دیکھا کہ حضرت بیگم لڑائی پر تلی ہوئی ہیں۔ تو حسن جہاں کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف لے گئیں اور انہیں سمجھانے لگیں کہ "بٹیا ذرا اپنی لٹو کو روکو۔" تو ہنس کر کہتی ہیں "خالہ اماں! آپ کے سر کی قسم جو میں نے انہیں کچھ بھی کہا ہو۔ وہ مجھے پنجنی، کنجری اور خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ جھاڑ کا کانٹا بن کر مجھے چمٹ گئیں۔ میرے گلے کا ہار ہو گئیں بے بات۔ مگر میں ان کے کہنے کا برا تھوڑا ہی مانتی ہوں۔" ادھر تو یہ نوکا جوکی ہو رہی تھی اُدھر صدر دالان میں ڈومنیوں کا ناچ ہو رہا تھا۔ بیل پر بیل پڑ رہی تھی۔ ان ڈومنیوں سے تو کمبخت ہیجڑے دروازے پر آکر اچھا گاتے بجاتے ہیں۔

رات کے بارہ بجے برات آئی سمدھنیں بڑے جلوسے کے ساتھ اتریں۔ کمخواب، زری، بوٹی، بوتھ کی تہ پوشیاں، نیچے نیچے کرتے، ہمارے بچپن میں کوئی بیوی کرتہ پہنے آجایا کرتی تھی تو اس پر تیلن گھوسن کی پھبتیاں اڑا کرتی تھیں یا اب ساری بیگموں نے یہی وضع طرح لے لی ہے۔ سچ ہے "کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات بڑی۔" سمدھنیں بڑے ٹھسے کے ساتھ مسند پر گاؤ تکیے سے لگ بیٹھیں شربت پلانے کے لئے بھی ہماری بجلی بسنت بی حسن جہاں اور مبارک نسا رکھڑی ہوئیں۔ مبارک نسار کے ہاتھ میں چاندی کی کشتی اور اس میں شربت کا شیشہ، بلور کی پیالی اور بی حسن جہاں کے ہاتھ میں ریشم کا رومال منہ پونچھنے کے لئے۔ اللہ کی بندی رومال کا گھسا اس زور سے دیتی تھی کہ شربت پینے والی تڑپ جاتی تھی۔ منہ اور باچھیں چھل کر لال ہو جاتی تھیں۔ بعض جلی تن کہہ دیتی تھی "اے پھٹکار یہ منہ پونچھتی ہو یا کبھی کا

بیر نکالتی ہو۔

آغائی بیگم دولھا کی بہن کا مُنہ پونچھا تو رگڑ کے ساتھ اُن کی ناک کی کیل اُلجھ کر ناک میں سے نکل گئی۔ "شاباش بوا شاباش۔ دیکھنے کی تو تم کامنی سی ہو۔ مگر ہاتھ تو ماشاءاللہ لوہے کی میخیں ہیں۔۔ دیکھو میری ناک کی کیل تمہارے رومال میں اُلجھ کر چلی گئی ہے۔"

حسن جہاں "بوا اوکھلی میں سر دیا تو دھکوں سے کیوں ڈرتی ہو۔ خدا رکھے بھائی کو بیاہنے آئی ہو نیگ جوگ کے روپے ڈھیر سارے تمہارے ٹکڑ میں جائیں گے سمدھن بننا ٹھٹھہ ہے۔ ابھی تو مُنہ پچھوانے میں بولا گئیں جب ڈومنیوں کی موٹی موٹی گالیاں کھاؤ گی اس وقت معلوم ہوگا کہ کے بیسی کا ساٹھ ہوتا ہے۔ اور بوا ناک کی کیل تو ہم نے دیکھی بھی نہیں۔ سچ کہنا بہن گھر سے پہن کر بھی آئی تھیں یا مفتِ خدا میں لئے مرتی ہو۔"

رومال جھاڑا تو اس میں کیل نہ نکلی۔

آغائی بیگم "بھئی اللہ جانتا ہے۔ ہماری کیل ڈھونڈو اس میں تر ملی جڑی ہوئی ہے۔"

حسن جہاں بیگم "بہن آغائی بیگم تم کیل کے مارے کیوں بلکی جاتی ہو۔ مانگے کی تو پہن کر نہیں آئی تھیں۔ تمہاری نہ ملے گی تو میں اپنی ہیرے کی کیل تمہیں دیدوں گی ذرا چھری تلے دم تو لو۔"

اتفاق کی بات کیل آغائی بیگم کی گود میں جا پڑی تھی۔ جب مل گئی تو حسن جہاں کی چڑھ بنی۔ کہنے لگیں "واہ بوا بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا کیل تو آپ چرائے بیٹھی ہیں۔ اور لوگوں کے اوپر دڑے پکڑتی ہیں۔"

فراق دہلوی

مہدی الافادی

مہدی حسن جو دنیائے ادب میں مہدی الافادی کے نام سے مشہور ہیں۔ غالباً ۱۸۶۸ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ سالِ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں۔ والد کا نام حاجی شیخ علی حسن تھا۔ مشرقی زبانوں کی تحصیل کے نام انگریزی زبان پڑھنی شروع کی اور انگریزی ادب میں کافی استعداد بہم پہنچائی۔ شادی کے بعد ۱۸۹۶ء میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ عرصہ تک نائب تحصیلدار اور تحصیلدار رہے ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو ۴۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔

جو سلیقہ اور نفاست مہدی الافادی کی تحریروں میں نظر آتی ہے اُن کی زندگی بھی اسی کا نمونہ تھی۔ اپنے دور کے تمام بڑے ادیبوں اور خاص طور پر شبلی سے اُن کی دوستی تھی۔ شبلی اُن کے بڑے قائل تھے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ " البشیر میں ایک مضمون دیکھا، نیچے تمہارے نام کے دستخط تھے، حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزاپوری دوست ہیں یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے"۔ ایک اور جگہ مہدی الافادی کے اسلوب کو سراہتے ہوئے شبلی نے لکھا ہے کہ۔ " کاش شعرالعجم۔ کے مصنف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے"۔

اُردو تنقید میں مہدی الافادی ایک طرزِ خاص کے مالک تھے۔ ان کی تنقید میں جدت اور معنی آفرینی کے ساتھ ایک تخلیقی اندازِ تحریر بھی ہے افاداتِ مہدی ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں اُردو کے ایک جواں مرگ ادیب کے سدا قائم رہنے والے نقوش ہیں۔

اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ

آئندہ زمانے میں اُردو لٹریچر کی اگر تاریخ لکھی گئی تو انیسویں صدی کا پچھلا دور اس عہد کا "نشاۃ ثانیہ" (یعنی دورِ جدید) ہوگا، جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایۂ ناز ایک بے غایت شاعری کا مجموعہ، خود رو تھا منازل ارتقائی طے کرتی ہوئی اس سطحِ امتیازیہ کے قریب قریب پہنچ گئی جہاں دنیا کی اعلیٰ تر زبانیں اپنا سکہ جما رہی ہیں۔

کل کی بات ہے جب تُک سے تُک ملا لینا کمالِ فن سمجھا جاتا تھا۔ گرمیٔ محفل کے لئے چند مصرعوں کی پیوند کاریاں لٹریچر کے فرائض سے ہم کو سبکدوش کر دیتی تھیں لیکن اقتضائے وقت کے ساتھ تغیرِ مذاق دیکھئے کہ آج ہم کو اُن کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔

یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کائنات میں کوئی چیز نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو۔ ہمارے جذبات بدلے، خیالات بدلے، تغیرِ حالت کے ساتھ وہ آثار خارجی بھی جن میں گھرے ہوئے تھے کچھ سے کچھ ہو گئے۔ غرض زمین بدلی، آسمان

بدلا اور ہم بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے، اور ابھی معلوم نہیں موثرات خارجی اور واقعات کی قدرتی رو ہم کو کہاں سے کہاں لے جائے گی۔

اس کشمکش اور سلسلۂ انقلابات میں اتنا ہوش کہاں کہ طبقات ارتقائی کی درمیانی کڑیاں آپ کو گنائی جائیں۔ صرف یہ سمجھ لیجئے کہ بوسیدہ اور فانی اجزاء کی جگہ قوی تر عناصر نے لے لی اور اقلیم سخن کی شریف تو ہستیاں عالم وجود میں آئیں جن سے اُردو سا کم سواد لٹریچر ایک دم سے آشنائے فلسفۂ ادب ہوگیا۔

میری غرض لائق عزت سر سید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی سے ہے جن کے قلم کے سایہ میں اُردو یعنی کل کی چھوکری اتنی رودار ہوگئی کہ السنۂ یورپ یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملاسکتی ہے۔ ان میں ہر شخص مختلف النوع خصائص ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کا آپ مالک ہے اور جس طرح ادب القدما (یعنی کلاسکس) آج واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے، ایک وقت آئے گا جب ان کے ادبیات کا بیشتر حصہ لائق پرستش اور غیر فانی سمجھا جائے گا۔

سر سید نے ادب اور معقولات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا دراصل ان کی اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ یہ اُن ہی کے قلم کی آواز بازگشت ہے جو ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کے لئے دلیل راہ بنی آج جو خیالات بڑی آب و تاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر کئے جاتے ہیں دراصل اسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں ورنہ پہلے یہ جنس گراں باوصفِ استطاعت اچھے اچھوں کے دسترس سے باہر تھی۔ سر سید کے کمالاتِ ادبی کا عدم اعتراف صرف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی

غلطی ہے اور میں خوش ہوں کہ شریف النفس حالی نے آج کل کی بہتر سے بہتر سوانح عمری لکھ کر منحرف طبائع کو بوساطت سخت سے سخت شکست دی، جو خیال میں آسکتی ہے۔ لیکن نئی نسل یہ پچھلا سبق کسی قدر بھول چلی ہے، حالانکہ سرسید کے حقوق زیادہ تر اسی کی گردن پر ہیں۔ بلکہ مجھے کہنا چاہیئے کہ لٹریچر کے حقوق کا اقتضا یہ ہے کہ سرسید کے علمی کارنامے پر نگاہ عکس ریز ڈالی جائے نذیر احمد گو ایک حد تک "عقلیات" سے رسیاں تڑاتے رہے لیکن ادب اور معقولات'' سے متعلق جو دفتر انہوں نے چھوڑا ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ سرسری ریمارک کرنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔ ان کی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرت بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدت خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اسی شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں۔ اس پر اضافہ کیجئے اردو کی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو۔

بعض صاحبوں کو غالب کی طرح مشکل پسندی کا رونا ہے اور وہ پیوندکاریاں جو اُن کی شستہ، رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوتی ہیں جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب جدت اختراع اور قوت آخذہ کا زور ہے۔ آمد کی رو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بلحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنہ غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں، تاہم متانت اور حسنِ کلام سے علیحدہ نہیں ہوتے جو انکے لٹریچر کا خاصۂ طبعی ہے۔ نہ انکے اچھوتے اور مستقل طرز ادا (اسٹائل) پر حرف [illegible]

عام سے الگ تھلگ اور آپ اپنی نظیر ہے، کوئی اثر پڑتا ہے۔ جو باتیں اوروں کے ہاں بے گانی ہیں ان کی بے ساختگی اور برجستگیٔ خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان میں اس طرح جذب ہو جاتی ہیں کہ مغائرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر بھی جہاں تک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجائش ہے ادب چاہتا ہے سبک نکتہ چینیوں سے ان کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ باوصف کمالات علمی جو ایک حد تک اُن کے ہمعصروں کو بھی مرعوب کرنے والے تھے، اُن کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاق سخن کی آزمائش کا بہتر سے بہتر پیرایہ کیا ہو سکتا تھا۔

جس طرح ناولوں اور تراجم میں بہ رعایت فن یہ اپنی قادر الکلامی کا بڑے سے بڑا ثبوت دے سکے۔ لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے مثلاً فلسفہ، تاریخ وغیرہ جس میں وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوت استقرا، تفریح مسائل اور فلسفیانہ استخراج نتایج کے ساتھ غیر منقطع انضباط خیال کی ضرورت ہے، یہ قصداً اس طرف نہیں آتے یہی حد فصل ہے جو شبلی کے قلمرو سے ان کے دائرۂ کمالات کو جدا کرتی ہے اور یہی وہ آزادی ہے جس کے آثار ان کے لکچروں میں آپ دیکھیں گے اور جس کی بنا پر یہ اکثر کہا گیا ہے کہ وہ موضوع سخن کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا مرتبۂ انشا پردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ صرف زور بیان کا قصور ہے جو اظہار فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں

ہوتا۔

زمانہ کتنی ہی ترقی کرے اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کرسکتا جس کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں، جہاں تک لایق ادب "مشرقیت" کا تعلق ہے قوم کی یہ آخری بہار تھی۔ جس کے اجزا کچھ اٹھ گئے، کچھ باقی ہیں، قدیم علوم کے نام لیوا ایک آدھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ جس عربی، مرحوم عربی کو ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈھتے ہیں۔ علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہوگئی۔ مگر ان کا حصہ غیرفانی یعنی ان کی تصنیفات مرنے والی چیز نہیں۔ وہ اپنی بقائے دایمی کی آپ ضامن ہیں اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل (آئڈیل) ہے جس سے دنیا میں کوئی بے نیاز نہیں۔

نذیر احمد کے اُستادانہ اور باوقار لٹریچر کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اب ہو نہیں سکتی، لیکن اخلاف کے لئے جس قدر سرمایۂ علمی انہوں نے چھوڑا ہے وہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ ہم ان کی قیمتی تصنیفات کو سینہ سے لگائیں گے، آنکھوں میں جگہ دیں گے۔ دائمی جدائی کے بعد ادائے سپاس کا حق کچھ تو ادا ہو رہا ہے۔

سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو بوڑھے حالی ہیں۔ یہ ایک ہی وقت میں جہاں نظری شاعر ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے ناثر بھی ہیں لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ جس نزاکت کے ساتھ ادائے خیال کے مختلف پہلوؤں سے دیکھتے دیکھتے

یہ اپنا مطلب نکال لیتے ہیں، کثرت مواد کے ساتھ بھی دوسرے اس قسم کے لطیف تصرفات نہیں کر سکتے، طبیعت میں ایک چچا تلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو و زوائد سے غرض نہیں رکھتا اور ساتھ ہی کسی موضوع بحث میں ان نکات متعلقہ کی طرف نہایت خوب صورتی سے فوری انتقال ذہن کا باعث ہوتا ہے جو دراصل اس بحث کی جان ہوتے ہیں۔ لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دئے جائیں یہ سلاست و نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصہ میں آئی۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے خیالات مقالات میں جھول جھال یعنی کسی طرح کا "تذبذب فی الرائے" نہیں ہے۔ خالص یک رنگی ہے۔ جسے اصطلاح میں فلسفیانہ کہئے۔ معیار خیال اس قدر بلند پایہ اور سلجھا ہوا ہے کہ کہیں سے یہ بے گانے نہیں ہوتے مجھے ہنسی آتی ہے جب میں سنتا ہوں کہ حالی کی جدید شاعری بلحاظ فن ساقط المعیار ہے اور اس لائق نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے۔ یہ فتویٰ پرانی لکیر کے شیدائیوں کا ہے۔ جو خیر سے یہ بھی نہیں جانتے کہ شاعری دراصل کیا چیز ہے اور اس کا موضوع اصلی کیا ہے۔ بھیڑوں کا ایک غول ہے جو مدت ہوئی آنکھیں بند کئے ایک راستہ پر پڑ لیا اور آگے پیچھے آج تک چلا آیا۔ لیکن ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں نہ ہم اس مجموعۂ روایات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو پرانے خیال والوں کا سرمایۂ ناز ہے۔ ہم ایک حد تک معصوم حماقتوں سے کسی کی ہوں لطف

اٹھانے کے لئے تیار ہیں کیوں کہ یہ بھی ایک عیش ہے، صرف اتنا کیجئے کہ برے بھلے حالی کو جدید گروہ کی لائق فخر پیشوائی کے لئے چھوڑ دیجئے

یادش بخیر! شبلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جس سے زیادہ ایک مُصنف پر قلم آزمائی کی گنجائش نہیں، چبائے ہوئے نوالوں کا بار بار منہ میں پھیرنا، خواہ وہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں جدت طرازی جائز نہیں رکھتی اور چونکہ کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا اس لئے مختصراً اس قدر کافی ہے کہ شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشاف و نکتہ آرائیوں سے ایک مستقل فن بنا دیا۔

علی گڑھ کو انہوں نے چھوڑا اور ندوۃ العلما نے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، خود ان کو۔ لیکن میرا بس ہو تو شبلی کو ہندستان سے باہر کالے کوسوں یورپ کے کسی "بیت الحکماء" (لٹریری اکیڈمی) میں بھیج دوں جہاں ان کو اپنی غیر معمولی قابلیت کی داد بڑے بڑے علمائے مستشرقین سے ملے گی جو بلحاظ ہم فنی ان کے یاران طریقت ہیں۔ شبلی کا وسیع دائرہ تحقیقات اہل زبان کی سی فارسی اس میں بھی شاعری کا ملکۂ راسخہ اور سب سے زیادہ اپنی زبان میں ان کی لائق رشک انشا پردازی وہ صفات ہیں جو علانیہ ان کو ہم نفسوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ شعر العجم کے چوتھے حصہ میں فلسفۂ شاعری پر مختلف پہلوؤں سے جس جس طرح تنقید کا حق ادا کیا ہے "ادب الاساتذہ" کا بہتر سے بہتر مرقع ہے جس پر دنیا کی کوئی زبان فخر کر سکتی ہے۔

اُردو میں ان کے مطالبات نظم کو جو جدید پیدا ادار ہیں ان کے سلسلہ

کمالات سے علیحدہ کر کے دیکھیے۔ جن میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے شوخی کے ساتھ سنجیدگی یہ معلوم ہوتا ہے۔ دور سے بلائیں لے رہی ہیں۔

لیکن اس جامعیت کے ساتھ بھی سوال یہ ہے کہ قوم نے کہاں تک حوصلہ افزائی کی۔ کل کی بات ہے، اتفاقی واقعہ پر شبلی پر ملک کے چپہ چپہ سے لے دے شروع ہوگئی اور اس قدر غل شور ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے۔ جس سے کچھ دنوں کے لئے اخباری اُفق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہوگئی۔ کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟ ہرگز نہیں صرف حاسدین کی کم نظری تھی۔ دلوں کی جمی ہوئی سیاہی لغزش قلم سے ٹپکی اور بُری طرح ٹپکی۔

لیکن شرافت علم دیکھیے! شرر کو جو شبلی پر کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں کرتے تھے اس ناگوار واقعہ کے بعد جس کا انجام ندوہ سے مولانا کی دست کشی پر ہوا، اپنی آواز بلند کرنی پڑی۔ وہ صاف صاف کہہ گزرے کہ ندوہ میں جو کچھ دم تھا شبلی کی وجہ سے تھا، اب وہ ایک جسد بے روح ہے اسی ضمن میں مولانا کے کمالات کا شناسانہ اعتراف اور قوم کی ناسپاسی کا رونا تھا۔

"نقاد" میں "تاریخ کا معلم اوّل" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ ایک قاصر النظر نے اہتمام کے ساتھ "مشرق" میں اس کی تردید کی

جسارت کی لیکن عامیانہ و حاسدانہ، جس میں علامہ شبلی کو ان اوصاف سے معرا کر کے دکھایا گیا تھا جو مضمون نگار نے حسن عقیدت سے نہیں بلکہ خود "فلسفہ" کے ایما سے غیر فانی شبلی کی طرف منسوب کئے تھے۔

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ شبلی پر اگر کوئی قلم اٹھانا چاہے تو جی لگنے کے سامانوں میں کمی نہیں۔ میرے خیال میں سید عبدالماجد اگر فلسفہ تاریخ سے اتنی ہی دل چسپی کا اظہار کرتے جس اہتمام سے "الکلام" پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی تو کفارۂ معصیت کے ساتھ تنقید کا بھی حق ادا ہو جاتا۔

سب سے آخر مگر دراصل سر فہرست آزاد پر میں خود کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ آزاد اس پائے کے ادیب ہیں کہ ان کے دائرے کے اندر خلاقین سخن کو ان کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ آزاد کی جن حیثیتوں پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ پڑ سکتی ہے وہ تحقیقات السنہ کے مذاق کے ساتھ پاکیزگیٔ زبان اور آزاد کا خاص انداز بیان ہے جس سے ان کی نثر عموماً نثر نگار معلوم ہوتی ہے۔

ایک مغربی شاعر کے خیال میں جس نے شوخی سے عالم فطرت (نیچر) پر کمال صنعت (آرٹ) کو ترجیح دی ہے۔ خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرش ریشمی پر بکھر جانا روانی آب سے زیادہ دل کش ہے مگر اس سے زیادہ تر دل کش ہے کسی نازک خیال مصنف کی مرصع پیداوار دماغی جو حسن صوری اور معنوی کے ساتھ آمد اور بے ساختہ پن کی تصویر ہو۔ اس کے سلیس و نفیس لٹریچر کا یہ وصف اضافی کہ روکھے پھیکے مسائل کو بھی اس

لطافت سے جذب کر سکے کہ کہیں سے بار طبیعت نہ ہو اور افسانے (یعنی لائٹ ریڈنگ) کا لطف آئے، میرا خیال ہے، لائق ذکر خصائص میں سے ہے جن کی بنا پر ایک مشہور موقع پر کہا تھا کہ "آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے"۔

جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے اُردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور .... صرف آزاد ہیں۔ اور گو اس مسئلہ پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے لیکن آزاد کی ادبی فتوحات، تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا۔ جن حضرات کی نگاہیں دلی، لکھنؤ کے اختلافات تک محدود ہیں یا جن کی قاصر النظری میرے اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں بلا خوف تردید یہ عرض کروں کہ پروفیسر آزاد کا درجہ بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفۂ لٹریچر سے قطعاً بے گانہ ہے آسان نہیں ہے۔ اس لئے کسی اختلافی بحث کا چھیڑنا "گول خانے میں چو کھنٹی چیز" سے بھی زیادہ گیا گزرا ہوگا۔

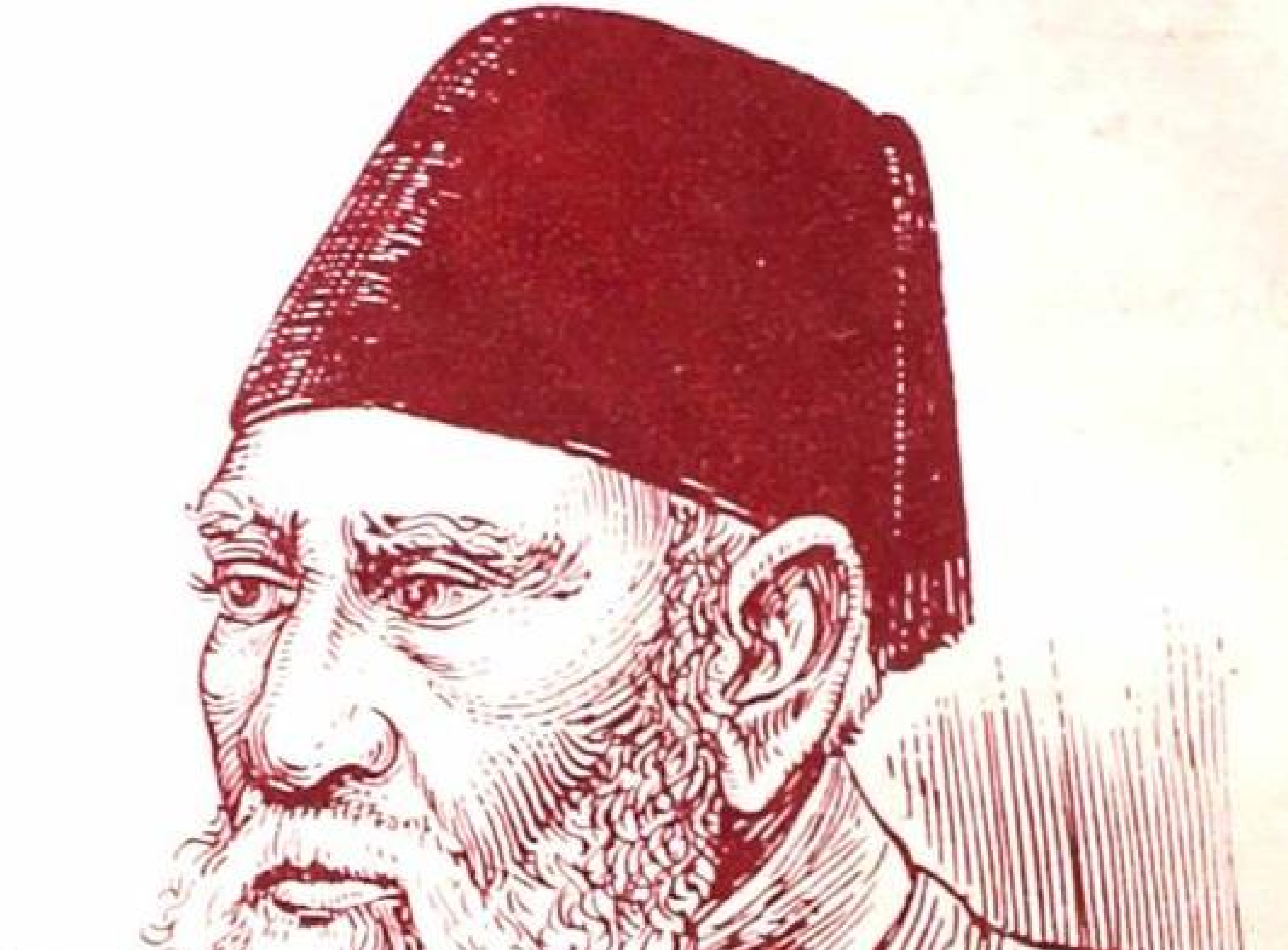
سر سید سے "معقولات" الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں لیکن "آقائے اُردو" یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسی لئے واقعات بھی انھوں نے جس قدر لکھے ہیں "قصص" (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں "افسانہ"، "یاران کہن" سمجھئے۔

مہدی الافادی

علامہ راشد الخیری

آپ ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالواجد تھا۔ خیری کی وجہ یہ ہے کہ ان کے جدِ اعلیٰ مولانا ابوالخیر خیر اللہ تھے جو عہد شاہجہانی میں عرب سے آکر بس گئے تھے۔ اسی لحاظ سے وہ راشد الخیری کہلاتے ہیں۔ دادا جان سے فارسی اور اُردو گھر ہی پر پڑھی۔ اس کے بعد عربی اسکول میں داخل ہو گئے۔ انگریزی کے سوا بقیہ مضامین سے انہیں نفرت ہی رہی۔ ان گھنٹوں میں یہ جماعت سے غائب ہو جاتے تھے۔ مولوی نذیر احمد خاں ان کے پھوپھا تھے۔ کچھ عرصہ مولانا حالیؔ سے بھی سبق لیتے رہے۔ اس زمانے میں ملک میں جہالت و بے علمی کا دَور دَورہ تھا۔ سب سے بُری حالت عورتوں کی تھی۔ بے چاریاں طرح طرح کے ظلم سہتی تھیں اور اُف نہ کرتی تھیں۔ راشد الخیری نے یہ حالت دیکھی تو دل تڑپ اٹھا۔ تہیہ کر لیا کہ اس ظلم کو مٹا کر دم لوں گا۔ اس دن سے جو قلم اٹھایا تو ایسی ایسی دردناک کہانیاں سُنائیں کہ قوم نے آپ کو "مصورِ غم" کا خطاب دیا۔ ایک دو نہیں پچاس ساٹھ کتابیں اپنی زندگی میں لکھ ڈالیں اور ۱۹۳۶ء میں اس دنیا کو خیرباد کہا۔

المیہ ناول اور افسانہ نگاری میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ ناول نگاری میں ڈپٹی نذیر احمد کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کی عبارت میں درد اور سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے! بیگمات دہلی کی صاف ستھری زبان لکھتے ہیں



مصور غم مولانا راشد الخیری

بے زبانوں کی زبان

ان کے ناول پڑھنے والوں کا دل ہلا دیتے ہیں لیکن دردناک انجام ایک سنہری دور کے آغاز کی خبر دیتا ہے کہ نسوانی دنیا جلد اپنے گھروں میں بہشت کی بہار کا لطف اٹھانے والی ہے۔ مولانا کی تصانیف میں صبح زندگی، شام زندگی اور شب زندگی بہت مقبول ہوئیں اور یہی ان کے شاہ کار ہیں۔

اگلے لوگ

اگلے وقتوں کے بچے کھچے بڈھے ٹھڈے، جو صبح شام کی ہوا کھا رہے ہیں ان کا ذکر نہیں۔ بحث تو ان اچھی بھلی صحیح تندرست صورتوں سے ہے جو رفتارِ زمانہ کے پہیئے دونوں ہاتھوں سے دھکیل رہی ہیں۔ تھوڑا بہت کر لیا اور بہت کچھ کرنا ہے۔

منصف مزاج دوستو! آخر وہ موقع آگیا جس کا مدتا سے ارمان تھا اور وہ وقت آپہنچا جس کے واسطے برسوں سے آنکھیں ترس رہی تھیں۔ آج وہ دن ہے کہ پکی محلسرا ہو یا ٹوٹا سا گھر، بڑا بھاری شہر ہو یا چھوٹا سا گاؤں، دیوار و در سے ترقی کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، گوشے گوشے اور چپے چپے غرض کونے کھدرے تک تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ملکۂ مغرب کی سواری اپنے وطن سے روانہ ہو کر دریائی مسافت طے کر رہی ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ مشرقی حدود میں داخلہ ہو۔ ذرا اس دلہن کے اقبال کو دیکھو مرد تو مرد عورتیں تک سارے جھگڑے بھول بھال اور گھر کے دھندے چھوڑ چھاڑ مہمان کے استقبال کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ مزا یہ ہے کہ سب ایک رنگ میں رنگے

ہوئے ہیں۔ ادھر امیر اپنے کمرہ نشست کو مختلف تصاویر سے مزین کر رہا ہے تو ادھر فقیر اپنے کچے دھاگے پر لال تندی لپیٹ رہا ہے کہ کسی طرح حقِ مہماں نوازی ادا کر دوں کچھ عجیب طلسم کا سماں ہے۔ جدھر نظر جاتی ہے ہر شخص اپنی کینچلی بدلے فلاح و بہبود کے گلدستے ہاتھوں میں لئے موجودہ طرز معاشرت پر لعن طعن کرتا ترقی کی صدائیں لگا رہا ہے۔ کھڑے کھڑے پاؤں شل ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ سوچتے سوچتے دماغ چکرا گیا مگر ابھی اس سیم تن کا نظارہ نصیب نہیں ہوا جس کے انتظار میں بیسیوں راتیں سحر کیں اور مہینوں دن بسر کئے۔

میدانِ ترقی کے بہادرو! تمہارا اشتیاق سر آنکھوں پر، تمہاری سرگرمی چشمِ ما روشن دل ما شاد، مگر عقلِ سلیم اتفاقِ کل سے متامل ہے۔ جس طرز معاشرت کو جہالت سے تعبیر کر رہے ہو۔ ذرا اس پر غور کی نظر تو ڈالئے۔ شہر آبادی یعنی دلی بسنے کا وقت ہے۔ یہی چراغ سحری جواب ایک آدھ جھونکے کے مہمان ہیں۔ اپنی روشنی سے شہر بھر کو منور کر رہے ہیں۔ چشمِ تامل سے دیکھنا۔ کیسی کیسی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں کچا پکا مٹی گارے کا گھر ہے۔ مگر لیا لپا یا چندن سا! جھاڑو بہارو سے فراغت پا، پکا ریندھ، کھانے سے پہلے کھلانے بیٹھیں۔ باسی کوسی، مستی کستی، جو میسر ہے پڑوس کے اندھے دھندوں کو بھیجا۔ کنبہ کے غریب محتاجوں کو دیا۔ بچا کھچا اچھا برا آپ کھایا۔ ذرا انصاف کی نظر سے دیکھنا ان کے زیور عصمت و عفت میں ہمدردی کا جوہر کس آب و تاب سے چمک رہا ہے۔

ان کو خاوندوں کے ساتھ برابری کا دعویٰ نہیں۔ اپنی راحت، اپنا عیش، اپنا سکھ، اپنا چین، ان کی خوشی پر قربان کر چکیں۔ طوقِ غلامی سمجھو یا اطاعت و

فرماں برداری کا چندن ہار، ان کے گلے میں کچھ ہے تو سہی، ان کے دروازے پر گھنٹوں کھڑے رہو۔ ان کی ڈیوڑھیوں پر گھڑیوں کان لگاکر سنو، ان کی آوازیں ہوا کچی دیواروں سے باہر نہ لائے گی۔"

خدا معلوم ان جاہلوں کی طبیعت میں قدرت نے کوئی مادہ ودیعت کیا ہے یا صحبت کا اثر اور تربیت کا فیض ہے۔ بہنیں بھائیوں پر پروانہ، بھائی بہنوں پر جان نثار، لڑکیاں اطاعت گزار، لڑکے فرماں بردار، بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ، تعلیم، شرم، حیا، تمیز ان کی گھٹی میں ہے۔

یہ سفید ڈاڑھیاں، یہ متبرک صورتیں جو عنقریب صفحۂ ہستی سے نابید ہو جائیں گی۔ آج تمہارے راج میں بے وقوف سہی، لکیر کی فقیر سہی، مگر ان کی زندگی کے پچھلے ورق تو الٹ کر دیکھو۔ زمانہ کا رخ بدل جائے۔ ہوا کے جھکڑ چل جائیں! ان کے کارنامے مٹنے والے نہیں، ان پتھروں سے مروت اور محبت کے ایسے چشمے پھوٹے کہ راستہ چلتے مسافر مگن ہو گئے۔ ذرا ان بڑے میاں کو دیکھنا منڈا ہوا سر، بھدی جوتی، کھدی ململ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا۔ ہاتھوں میں دونے، بغلوں میں پوٹلیاں سر پر گڑ کی بھیلی، کندھوں کا بوٹ لودھے بھدے لڑھکتے بڑھکتے چلے آرہے ہیں ان پر ہنسو، قہقہے لگاؤ۔ ٹھٹھے اڑاؤ۔ مگر ان کی کیفیت بھی تو سن لو۔ مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی۔ پڑوس کی پردہ نشین رانڈیں جن کے ہاں گھس لگانے کو مرد کا نام نہیں۔ کبھی کی بیٹھی راہ تک رہی تھیں۔ ان کے گھروں پر گئے۔ پیسے لئے سودے پوچھے۔ اپنا کاروبار رکھ، محنت مزدوری چھوڑ بازار گئے۔ یہ انہیں دکھیاریوں کا بوجھ ہے۔

زمانے کے نبض شناسو! عالم ہو، لائق ہو، فائق ہو، کچھ ہی بن جاؤ اور

اور کچھ ہی ہو جاؤ مگر پھوا صاف بتا رہی ہے کہ اب یہ انداز رخصت ہوئے البتہ آنے والی نسلیں سُن لیں گی کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں۔ جن کے قدموں میں خُلق و تہذیب کے دریا لوٹتے تھے۔ زمانہ ان واقعات کو فسانہ بنا دے گا مگر یہ کہانیاں بہت روز تک باقی رہیں گی۔

ذرا زمانۂ جاہلیت کے بہن بھائی دیکھنا۔ محبت کی سرسبز اور شاداب ٹہنی پر کیسے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہے تو زچہ گیری مگر جوشِ محبت کی پوری تصویر ہے۔ بھائی کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ پردیسن بہن یہ سُن کر پھولی نہیں سماتی بھتیجے کے لئے ہنسلی، کڑے، بھاوج کے لئے جوڑا لے کر بھائی سے نیگ لینے کے لئے آئی ہے۔ کس محبت سے کہتی ہے ؎

رہیرل! بھیا میں تیری ماں جائی — ہو کر سُن کر بدھاوا لے کر آئی
چھاتی دھلائی کٹوری لوں گی — تو لٹ دھلائی روپیہ!
پاؤں دھلائی جھری لوں گی — تو شوہر کے چڑھنے کو گھوڑا

بھائی کی خوشی میں شریک ہو کر نیگ لینے کے حقوق کیسے مزے سے جتا رہی ہے۔ بھائی سے اتنا خطاب کر چکی تو اب بھاوج سے دو دو باتیں ہیں ؎

یہ نہ سمجھیو بھاوج موری نند جیبی نہیں آئی
تیرے للا کو ہنسلی اور کڑے، تجھکو جوڑا لائی

بھائی پر تو وہ کچھ زور تھا مگر اس خیال سے کہ بھاوج پر بار خاطر نہ ہو، یوں کہتی ہے: "فقر نہ سمجھیو کہ تیرے دروازے پر لینے آئی" "بڑوں کی مثل" بھائی مس لیجے۔ بھتیجا مس دیجئے" جو اپنا حق مانگ رہی ہوں۔ جو مجھ پر ہے۔ وہ یہ موجود ہے۔

یہ تمام قصہ طے ہو جانے کے بعد آخری بات بہن کے منہ سے نکلتی ہے وہ ایک پیٹ میں پاؤں پھیلانے کا سچا اثر ایک گود میں دودھ پینے کا پورا جوش ہے۔ جس دل سے یہ الفاظ نکلتے ہیں اس کی حالت قابلِ غور ہے کیسی سچی اور اچھی دعا ہے۔ ع

باگن میں جیسے آم پھلے رے ایسے پھلے میرا بھائی

الہ العالمین! جس طرح باغوں میں آم پھلتا ہے۔ اسی طرح میرا بھائی پھلے پھولے۔ بیٹے ہوں۔ پوتے ہوں۔ اس کے گھرے بسیں اور میرے باپ دادا کا نام روشن ہو۔

ملکۂ مغرب کے مشتاقو! یہ جلسہ ختم ہوا۔ جن چراغوں کی روشنی در و دیوار تک پھیلی ہوئی تھی ابھی کے بجھ گئے۔ صحبت شب کی شریک ایک آدھ شمع اِدھر اُدھر ٹمٹما رہی ہے۔ جو نسیم کے دو ایک جھونکوں کی محتاج ہے۔ جن مقدس صورتوں کی یہ برکت تھی۔ وہ سب خاک میں مل گئیں۔

عزیزو! دوستو! ایک وقت آئے گا اور ضرور آئے گا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو گے اور سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گے۔ اور یہ ریزہ جواہر جو زیر زمین ہوں گے ڈھونڈو گے مگر بے سود پر کھو گے۔ مگر بے وقت۔

بہار مشرق کے باغبانو! گو آج سنسان جنگل میں پڑے آرام کر رہے ہو مگر چمنستانِ حیات میں ایسے پھول لگائے ہیں کہ قیامت تک نہ مرجھائیں گے۔ بھانت بھانت کے پکھیرو اور رنگ برنگ کی بلبلیں بیٹھ کر چہکیں گی۔ اور ان کی مہکار مشرق سے غرب تک پھیلے گی۔ خزاں دنیا بھر کو مسمار کر دے مگر تمہارے مبارک ہاتھوں کی گلکاری صفحۂ ہستی سے مٹنے والی نہیں۔

علامہ راشد الخیری

نواب نصیر حسین خیالؔ

نواب خیالؔ ۱۸۷۸ء میں بمقام عظیم آباد (پٹنہ) پیدا ہوئے! ابھی تین ہی سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اپنی دادی نواب فاطمہ بیگم کے دامن تربیت میں پرورش پانے لگے، جب سات سال کے ہوئے اور دادی نے رحلت کی تو آپ نے سید الشعراء حضرت شادؔ عظیم آبادی کے ظلِ عاطفت میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ تعلیم اردو، فارسی، اور عربی تک محدود رہی۔ بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں آپ فارسی کے ماہر اور عربی کے جید عالم ہو گئے۔ انگریزی بعد کو سیکھی، فرانسیسی زبان بقدر ضرورت جانتے تھے۔

خیالؔ کا خاندان عرب سے ایران ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا تھا۔ ان کے بزرگوں کو مغل دربار سے جاگیریں اور التمغا عنایت ہوا۔ جاگیریں انہیں عظیم آباد کھینچ لائیں اور محمد شاہ اور فرخ سیر کے عہد سے یہیں رہنے سہنے لگے۔ خیالؔ کی مادری زبان دلی کی ٹکسالی زبان اردو تھی جو گھر کی بڑی بوڑھیوں سے ورثہ میں ملی تھی۔ نواب خیالؔ نے سترہ سال کی عمر میں قلم ہاتھ میں لیا پہلے دو سال عظیم آباد میں اور شادی کے بعد کلکتہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں سیر و سیاحت کے لئے انگلستان گئے۔ واپسی پر فرانس، بلجیم، جرمنی، اٹلی ہوتے ہوئے مصر آئے۔ قاہرہ میں ڈیڑھ ماہ قیام کیا۔ اخبار "الاہرام" (قاہرہ) نے آپ کے حالات و خیالات اپنے کالموں میں

شائع کئے جو بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے۔ نواب خیال نے دسمبر ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔ نواب اپنے قلم کے زور سے ادیب الملک بنے، اس پر لطف یہ کہ اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں چھوڑی، داستان اردو کے نام سے ایک بسیط کتاب زیر قلم تھی جس کا ایک حصہ "مغل اور اردو" کے نام سے چھپ گیا ہے۔ اس داستان کا نامکمل قلمی نسخہ آپ کے خاندان میں اب تک محفوظ ہے وہ اپنی طرز تحریر کے آپ موجد ہیں۔ ان کے موزوں الفاظ ان کے موضوع سے اس طرح دست و گریبان ہوتے ہیں کہ انہیں جدا نہیں کیا جاسکتا، حسن ترتیب، ہزار گونہ دلکشی اور گھلاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔ غرض جو کچھ بھی نواب خیال لکھتے ہیں اس میں سادگی و شوخی کے ساتھ غضب کا بانکپن ہوتا ہے۔

نواب خیال کے مضامین کی "سیر حسن" دکن ریویو، ادیب، علی گڑھ میگزین، اولڈ بوائے، سہیل، نقیب، آفتاب و شمس اور ندیم میں کی جاسکتی ہے۔

۱۹۱۶ء میں نواب نصیر حسین خیال آل انڈیا اردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے صدر بنے تھے۔ ان کا معرکۃ الآرا خطبہ کتابی صورت میں علیحدہ چھپ گیا ہے۔

اردو اپنے گھر میں

قدیم فارسی ارتباط اور پھر عربی اختلاط سے شمالی ہند پر جو اثرات پڑے اور ان کی وجہ سے پنجاب میں ایک مخلوط زبان کا جس طرح رواج ہوا اس کا حال اوپر گزر چکا۔ پھر ترکوں، تاتاریوں اور خصوصاً آل غزنہ سے خصوصیت اور آئے دن کی

ان سے صحبت کے باعث ان ملکوں کی بولیوں اور بھاکاؤں میں جو ملاپ ہو گیا۔ اس کا ذکر بھی ہو چکا اور اس سے اتنا سمجھ میں آ گیا کہ شمالی ہند ایک عرصہ سے ایک ایسی نئی زبان بول رہا تھا جسے نہ فارسی کے نام سے یاد کر سکتے ہیں اور نہ جسے ہندی کہہ سکتے ہیں۔

یہ گمنام زبان تغلقوں کے زمانہ اور ۱۳۲۰ء کے قریب، پورب آتی اور ادھر اس وقت گذر کرتی جب کہ لاہور (قدیم دار السلطنت) اُجڑتا اور دلّی راج دھانی بنتی اور سنورتی ہے۔ دلّی، اپنی ایک خاص زبان رکھتی تھی۔ اب وہ پھر ایک زمانہ کے بعد ہند کا مرکز اور پنجاب کی ایک نوآبادی بن کر نئی چھاؤنی کی سی زبان بولنے لگی۔ یہ وہی زبان تھی جسے ادیب فارسی بھاشا کہتے ہیں اور امیر خسرو جسے دہلوی کے پیارے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہ دہلوی اب تک اپنے شہر سے نکلی نہ تھی۔ مگر جو تغلقی، لاہور سے دہلی آئے اُنہیں دفعتہً دکن کی یاد آئی اور دولت آباد، ہند کا مرکز بن کر دلّی والوں سے آباد ہو گیا، ہماری یہ دہلوی ان کے ساتھ اُدھر پہنچی۔ اور کچھ دن وہاں اپنا نام قائم رکھ سکی مگر بعد کو وہ گجراتی (اُردو) اور دکھنی (اُردو) بن گئی۔ اس وقت دلّی بظاہر اُجڑی تھی۔ کیونکہ ادھر سے جو کھیپ دولت آباد گئی وہ وہاں چھاؤنی نہ ڈال سکی۔ یہ جماعت جلد لوٹی اور قاعدے کے موافق، اُدھر کے بہت سے الفاظ و محاورات کی سوغات بھی ساتھ لائی، جو گھر گھر ہٹی اور دلّی کے بازاروں میں عام ہوئی۔ دار السلطنت پھر بدلتا اور دولت آباد سے شاہی تزک دلّی واپس آتا اور وہاں جمتا ہے۔ دلّی اُس وقت سے مغلوں کے عہد تک آباد اور ہند کی ناک بنی رہی اور جس زمانہ کا ہم ذکر

کررہے ہیں۔ وہ شاہجہاں آباد کے لقب سے یاد کی جاتی اور ادب کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔

وہاں کی زبان کا نام اب دہلوی نہ رہا تھا وہ اُردو کہی گئی۔ پھر شاہجہانی اُردو پکاری گئی اور بعد کو اُردوئے معلّٰی کے پاکیزہ خطاب کی سزاوار ہوئی۔

یہ اُردوئے معلّٰی، قلعۂ معلّٰی اور امیروں، رئیسوں کے گھروں ہی میں نہیں بلکہ دہلی کے بازاروں میں بھی عام ہو رہی اور کام دے رہی تھی کہ عالمگیر، دکن پر چڑھا اور دہلی والوں کا ٹڈی دل لشکر اُس کے ساتھ اُدھر گیا اور مدتوں وہاں رہا۔

زمین دکن میں اس طرح اُردوئے معلّٰی کا بیج پڑا، اور بعد فتح اُدھر سے دکھنی اُردو کا جو پھل، فاتحین کے ساتھ ادھر آیا وہ دلّی کے باغ میں تحفہ بنا رہا، بعد فتح دکن، نہ صرف دلّی کے لشکری ہی خوش خوش گھر لوٹے بلکہ اُدھر کے شاہزادے اور اُمرا، اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر دارالسلطنت میں آبسے اور دلّی کو آباد کرتے رہے۔

معظم (بہادر شاہ اوّل) نے ان واردین کی تعظیم کی۔ قطب شاہی شہزادوں کو اپنے تخت کے پاس اعزازی کرسی دی۔ یہ شہزادے اور دکھنی امیرزادے شہر (دلّی) میں اعزاز و اکرام سے رہے۔ ان کی صحبتوں کا دلّی اور دلّی والوں پر اثر پڑا۔ اس سے نہ صرف ان کی معاشرت و تہذیب اور ان کے روزمرہ ہی میں فرق آیا بلکہ اُس نے اُردوئے معلّٰی اور دکھنی اُردو کو منہ بولی بہنیں بھی بنا کر یک جان دو قالب کردیا۔ دکھن میں زمانہ سے ادھر کی اُردو (دکھنی) شاہی محلوں اور دفتروں میں بار پا چکی اور ادیبوں اور شاعروں کی زبان بن چکی تھی وہ (ادیب) ادھر آئے تو اپنا یہ تحفہ ساتھ لائے۔ دلّی والے اپنے بچّہ (اُردو) کو غیروں کی گود میں یوں

دیکھکر شرمائے۔ آخر متوجہ ہوئے اور اس طفل کے ساتھ حق پدری ادا کرنے لگے۔ مرزا عبدالقادر بیدل اور میر جعفر زٹل جنہوں نے دکھن کی ہوا بھی کھائی اور اعظم و معظم کے متوسلین میں سے تھے۔ پُرانی صف سے بڑھنے اور اس معصوم (اُردو) کے سر پر ہاتھ رکھنے لگے، پھر تو ساری دلّی گونج اُٹھی۔ اور گھر گھر سے اسی کی صدا آنے اور دلوں کو لُبھانے لگی۔

نصیر حسین خیال



سر شیخ عبدالقادر

اُردو کا ایک عظیم محسن

شیخ عبدالقادر

شیخ صاحب ۱۸۷۴ء میں بمقام لدھیانہ پیدا ہوئے ۔ والد کے انتقال کے وقت شیخ صاحب صرف پندرہ سال کے تھے ۔ آپ کا زمانہ طالب علمی نہایت کامیاب گزرا ۔ بیس سال کی عمر میں آپ نے فارمین کرسچین کالج لاہور سے اوّل درجے میں بی ۔ اے پاس کیا ۔ تعلیمی دور ختم کر کے آپ "پنجاب آبزرور" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں منسلک ہو گئے اور رفتہ رفتہ اس اخبار کے چیف ایڈیٹر بن گئے ۔ ۱۹۰۱ء میں اپنا رسالہ "مخزن" نکالا جس کی یاد آج تک دلوں میں تازہ ہے اِس لیے کہ وہ اپنے وقت کا بہترین رسالہ تھا ۔ بعد ازاں انگلستان جا کر بیرسٹری کی سند حاصل کی اور لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے ۔ اس کے بعد لاہور آ کر پریکٹس شروع کی کچھ عرصہ بعد ہائی کورٹ کے قائم مقام جج بنائے گئے ۔ تین سال بعد پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے ۔ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کی طرف سے مجلس بین الاقوامی کے ساتویں اجلاس میں جو جنیوا میں ہوا تھا ، بحیثیت ڈیلی گیٹ شریک ہوئے ۔ واپسی پر لاہور ہائی کورٹ کے مستقل جج بنا دیے گئے پھر انڈیا کونسل کے رکن بنے ۔ چند ماہ حکومت ہند کے لا ممبر بھی رہے ۔ ریٹائر ہونے پر بہاولپور میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز رہے ۔ ۱۹۵۰ء میں چھہتر برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے ۔

شیخ صاحب کا طرزِ تحریر نہایت شستہ اور عام فہم ہے ۔ دلی لگاؤ نے ان کی زبان میں وہ صلاحیت پیدا کر دی ہے جو صرف اہلِ زبان کا حصہ ہے ۔ ان کی تحریرات میں ہر جگہ متانت اور شگفتگی کا امتزاج ملتا ہے ۔ "سفر نامہ یورپ" اور "مقام خلافت" ان کی مشہور تصانیف ہیں ۔

گُل بازی یا گُل باری

یوں تو میلے تماشے ہر ملک میں اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور کون سا آباد ملک ہے جو اپنی دلچسپیوں سے خالی ہے۔ مگر چند ہفتے ہوئے مجھے بولون علاقۂ فرانس میں ایک نہایت اُجلا میلہ نظر آیا جس میں اس شہر نے کمال نفاست سے کام لیا تھا اور جسے دیکھنا شمالی فرانس کی زندگی کے ایک نادر پہلو کو دیکھنا تھا۔ اس کے فرانسیسی نام کا لفظی ترجمہ تو پھولوں کی لڑائی ہے۔ مگر چونکہ اس میں ایک پرانے ایشیائی کھیل کا اصول موجود ہے۔ اس لیے ہم اسے گل بازی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جس کثرت سے اس میں دو گھنٹے پھول برسائے گئے۔ اگر اس کثرت کو ملحوظ رکھیں تو اُسے گل باری کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

بولون شمالی فرانس کے اُن مقامات میں سے ہے۔ جہاں لوگ جولائی اور اگست کے مہینوں میں گرمی کا موسم بسر کرنے جاتے ہیں۔ نہ صرف قرب و جوار کے فرانسیسی آتے ہیں۔ بلکہ پیرس تک کے لوگ سمندر کے ساحل کی کشش سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ گو ساحل کی زندگی کا شوق فرانس میں اس درجے پر نہیں جس درجے پر انگلستان میں۔ بولون چونکہ انگلستان کے ساحل جنوبی کے مقابل واقع ہے۔ اس لیے انگریز بھی اس موسم میں کثیر تعداد میں بولون کی رونق بڑھاتے ہیں۔

گلُ باری میں سب شریک ہوتے ہیں۔ مسافر اور مقیم انگلستان سے آئے ہوئے مہمان اور فرانس کے اہلِ وطن، بوڑھے اور جوان، عورتیں اور بچے۔ بانکے چھیلے اور سیدھے سادے۔ کون ہے جو احاطے کے اندر داخلے کے چند پیسے دے

سکتا ہے اور نہیں جاتا۔ عین کنارِ آب پر ایک تماشا گاہ ہے جس کے متعلق ایک باغیچہ ہے۔ وہی باغیچہ اس مرتبہ اس میلے کے لیے مقرر تھا۔ کئی دن پہلے سے تیاریاں تھیں۔ اس کی روشیں آراستہ کی گئی تھیں۔ اور روشوں کے دونوں طرف نشست کا سامان تھا۔ ایک طرف اونچے اونچے عارضی چبوترے جن پر ممتاز لوگ جو مدعو تھے۔ یا جنھوں نے زیادہ قیمتی ٹکٹ خریدے تھے۔ اور دوسری طرف صرف بنچ اور کہیں کہیں کرسیاں جن پر ان سے کم قیمت ٹکٹ لے کر لوگ بیٹھ سکیں۔ صبح سے گل فروشوں کی دکانیں غیر معمولی طور پر پھولوں سے پُر نظر آنے لگیں اور دوپہر کے بعد اس باغیچے کے قریب بھیڑ بھاڑ شروع ہوگئی اور اس کی سڑک پر دُکانوں کی قطاریں ہندوستان کے میلوں کی طرح لگ گئیں۔ چار بجے اصل تماشا شروع ہوا۔ تمام نشستیں تماشائیوں سے پُر تھیں اور ان کے سوا ایک بڑی تعداد ایسے تماشائیوں کی تھی۔ جو صرف داخلے کا ٹکٹ رکھتے تھے۔ اور انہیں میلے کے ہر حصے میں چلنے پھرنے کی اجازت تھی۔ مگر ان کے لیے بیٹھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔

سب تماشائی پھولوں سے جھولیاں بھرے ہوئے تھے۔ گو جھولی بجائے کرتے یا دوپٹے کی جھولی کے کاغذ کی جھولی تھی۔ اور بعض زیادہ دولت مند لوگ نہایت خوش نما اور قیمتی گل دستے لیے کھڑے تھے۔ اتنے میں سواریِ گُل کی آمد آمد ہوئی۔ تحسینِ گل کا شور اُٹھا۔ اور سب متوجہ ہو گئے۔ سب سے آگے ایک گاڑی تھی۔ ہمہ تن گل۔ گھوڑا تو سر سے پاؤں تک پھولوں سے سجا ہوا۔ پہیے پھولوں سے اٹے ہوئے۔ پشت پر ایک تختۂ گل اور وسط میں ایک خوبصورت ٹوکری پھولوں کی۔ غرض اندر پھول باہر پھول۔ اس میں ایک معزز فرانسیسی لیڈی ایک پُھول سے

بچے کو ساتھ لیے بیٹھی تھی - چہرے پر باریک پھول دار نقاب، ٹوپی پر پھول اور تکیے پر پھولوں کی چادر - اس پر پھول برسنے شروع ہوئے - دونوں طرف سے بوچھاڑ ہوتی تھی - اور وہ ایک ہاتھ سے گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے ایک ہاتھ سے سب کا جواب دیتی جاتی تھی -

اس گاڑی کے پیچھے ایک دو اسپہ گاڑی تھی - جس کی سجاوٹ اس سے کچھ کم نہ تھی - صرف رنگ آمیزی میں فرق تھا - ہر گاڑی کی سجاوٹ میں ہر کسی نے اپنے اپنے مرغوب رنگ لگائے تھے اور اپنی پسند کے گل کھلائے تھے - اس میں چار لڑنے والیاں تھیں اور گھوڑے کی باگ کوچبان سنبھالے ہوئے تھا - جسے صفِ گل میں بیٹھنے کا انعام برابر مل رہا تھا - کئی دل لگی باز نشانہ اُڑاتے تھے - اور وہ جواب نہیں دے سکتا تھا - سر جھکائے ہوئے گاڑی ہانکتا جاتا تھا - اس گاڑی کا چبوتروں کے سامنے آنا تھا کہ چوگُھی لڑائی ہونے لگی - لوگ ہزاروں تھے تو کیا ہوا یہ بھی چار تھیں - ان سے کون بازی جیت سکتا تھا؟ جس طرف سے پھول آتا تھا اُسی طرف جواب جاتا تھا - کوئی گلدستہ پھینکتا تھا تو اُدھر سے بھی فی الفور بوچھاڑ ہوتی تھی - کسی کا وار خالی گیا تو یار لوگ ہنس دیے - کسی نے تاک کر پھول مارا تو واہ وا ہو گئی -

ان کے پیچھے ایک اور سواری تھی جس میں اس پُرانی رسم پر بیسویں صدی کا پیوند لگایا گیا تھا - یعنی موٹر کار اسی طرح پھولوں سے لدی ہوئی اس میں مرد اور عورتیں دونوں سوار تھے - اور چلانے والے کے سوا سب ہاتھ چلا رہے تھے - ایک گاڑی آئی جس میں بہت سے بچے تھے - ان کا آنا چھوٹے بڑے سب کے لیے

اشارہ تھا کہ "برس پڑو"۔ خصوصاً ہم عمروں سے ان کی خوب رہتی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور گاڑی آئی جس میں ایک زندہ دل بوڑھا اپنی بڑھیا کو لیے جلوسِ گل میں شامل تھا۔ کوئی نہ کوئی خدا ترس ان کی طرف بھی پھول پھینک دیتا تھا۔ اور یہ بھی کشادہ دلی سے پھول برساتے جاتے تھے۔ مگر عام دلچسپی اس گاڑی سے بہت کم تھی۔ اور چشمِ عبرت کو سبق ملتا تھا کہ ایسے کھیل ایک خاص وقت میں موزوں ہیں۔ اور جیتے جی وہ زمانہ آجاتا ہے جب زندگی کی بہت سی خوشیوں کو خیرباد کہنا ہوتا ہے۔

اسی طرح اور سواریاں تھیں جن میں ہر شخص نے اپنی توفیق اور شوق کے مطابق سجاوٹ کی تھی۔ اور یہ قطار کی قطار باغ کے گول چکر میں چلتی تھی۔ اور وسطِ صحن میں باجا بجتا تھا۔ چھ بجے تک یہ چکر جاری رہا۔ آخر کب تک چلتا۔ ہر انسانی خوشی محدود ہے۔ اور کیسی ہی پُرلطف کیوں نہ ہو آدمی خود اس سے تھک جاتا ہے۔ اس دو گھنٹے کے عرصے میں کئی پھولوں کی جھولیاں بار بار خالی ہوئیں اور بار بار بھری گئیں۔ پھول والے ٹوکرے بھرے بیٹھے تھے۔ میلے کے ختم سے پہلے سب بیچ کر فارغ ہو گئے۔ گاڑیوں میں بھی کئی دفعہ پھولوں کی مانگ ہوئی۔ مگر کتنا ہی بڑا خزانہ ہو۔ جب دونوں ہاتھوں سے لُٹایا جائے تو کہاں تک ساتھ دے گا۔ آخر پھول ختم ہو گئے۔ گھڑیال نے بھی آواز دی کہ جشن کے لیے وقت کے اٹل قانون نے جتنے منٹ اور جتنے ثانیے فیاضی سے عطا کیے تھے۔ سب ہو لیے۔ ہاتھ جو برابر مصروفِ ورزش رہے تھے پکار اُٹھے کہ اب استراحت درکار ہے۔ گھوڑے چکر لگاتے لگاتے تھک گئے اور فطرتِ انسانی کا مجموعہ جو انبوہ تماشائیوں

میں نمودار ہوا اپنی تغیّر پسندی کا ثبوت دینے لگا۔ تماشائی ایک ایک دو دو کر کے کھسکنے لگے اور آخر پھولوں والی گاڑیاں جس ترتیب سے آئی تھیں اُسی ترتیب سے قطار باندھے ایک بیرونی چکّر سے گھوم کر با ہر سڑک پر جا نکلیں مکانوں کے بالا خانوں پر اس واپسی کے دیکھنے کے لیے ہجوم ہو گیا۔ کہیں کہیں سے پھول بھی برسے۔ مگر تھوڑی دور جا کر یہ قطار منتشر ہو گئی اور ہر ایک نے اپنا اپنا راستہ لیا۔

شیخ عبدالقادر

سید سلیمان ندوی

شبلی خوش قسمت تھے کہ انہیں سید سلیمان ندوی جیسا جانشین ملا۔ سید صاحب نے شبلی کے عظیم کارنامہ سیرت النبی کی تکمیل کی، ندوۃ العلما کو وسعت دی، دارالمصنفین کو ایک بڑا علمی ادارہ بلکہ اکیڈمی بنا دیا، معارف کے ذریعہ تاریخ، ادب و مذہب کی خدمت کی اور یوں شبلی کی روایت کو آگے بڑھایا۔

سلیمان ندوی ۱۳۰۲ھ ہجری میں صوبۂ بہار کے قصبہ دیسنہ میں پیدا ہوئے۔ حکیم سید ابوالحسن آپ کے والد تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور اس کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ آ گئے۔ اُس زمانہ میں شبلی ندوۃ العلماء کے سکریٹری تھے۔ سید سلیمان کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انہوں نے سید سلیمان کو رسالہ الندوہ سے وابستہ کر دیا۔ ۱۹۰۶ء میں سید سلیمان ندوی ندوۃ العلماء میں عربی ادبیات کے استاد مقرر کئے گئے۔ یہ تمام عرصہ انہوں نے اپنے استاد کی معیت میں گزارا اور اُن کے بنائے ہوئے راستہ پر اُن کی رہنمائی میں آگے بڑھتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں شبلی کی وفات کے بعد سلیمان ندوی نے اپنی زندگی ان کے مشن کی تکمیل کے لئے وقف کر دی۔ سیرت النبی کی تکمیل کی، شبلی کی وصیت کے مطابق دارالمصنفین

قائم کیا۔ سید سلیمان ندوی نے بلادِ اسلامیہ کی سیر بھی کی۔ افغانستان وہ علامہ اقبال کے ساتھ گئے تھے۔ ساری عمر ندوہ اور دارالمصنفین کی خدمت کرتے رہے۔ تقسیم برِ صغیر کے بعد وہ پاکستان آ گئے تھے اور دو ڈھائی سال کے قیام کے بعد کراچی میں انتقال فرمایا۔ کراچی خوش نصیب ہے کہ اس کی آغوش میں وہ مردِ جلیل ابدی نیند سو رہا ہے جسے اقبال نے "علومِ اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد" اور استادِ کل کہا تھا۔

علامہ سلیمان ندوی اردو کے بڑے محسنوں میں سے ایک ہیں۔ ادب کی ہر شاخ اور شعبہ میں اُن کے کارنامے موجود ہیں، لیکن اُن کا خاص میدان مذہب اور تاریخ ہے۔ "سیرت النبی" اور "خطباتِ مدراس" اُن کی مذہبی کتابوں میں ممتاز ہیں۔ خطباتِ مدراس سیرتِ نبوی پر ایک نئے نقطۂ نظر کے آغاز کا درجہ رکھتے ہیں اور آج یہی اندازِ نظر عام ہو گیا ہے۔ یہ سید صاحب کی بڑی کامیابی ہے۔ تاریخ میں اُن کا شاہکار "عرب و ہند کے تعلقات" ہے۔ "حیاتِ شبلی" کے نام سے انہوں نے اپنے استاد کی ایک مفصل اور مستند سوانح لکھی ہے۔ "نقوشِ سلیمانی" اُن کے گراں مایہ مقالات کا مجموعہ ہے۔ عمر خیام پر اُن کی کتاب بہت اہم سمجھی جاتی ہے کیونکہ انہوں نے داستانوں کا سینہ چاک کر کے حقائق پیش کئے ہیں۔



علامہ سلیمان ندوی
علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد

سید سلیمان ندوی کا اندازِ تحریر صاف اور سلیس ہے۔ یہ سادگی بے رنگ نہیں بلکہ اس میں رعنائی اور لطافت بھی ہے، مگر اسی قدر جو مذہبیات اور تاریخ کے موضوعات کے مطابق ہے۔ اُن کا خلوص الفاظ میں کیمیاوی تغیر پیدا کر دیتا ہے اور اسی لئے اُن کے یہاں بے حد تاثر ہے۔

بُلبلِ ہزار داستان

وَقَعَتِ الوَاقِعَۃ آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دُنیائے فانی کو الوداع کہا، صفر کی اُنیسویں اور اپریل کی اکیسویں ی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ ہندوستان کی برو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم و گئی، ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسولؐ شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان، اور کاروانِ ت کا حُدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، س کے دہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل ا ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو تم ہو گئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، مید ہے ملت کا یہ غم خوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہو گا، اور قبول و مغفرت ے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے، خداوندا! اس کے دل شکستہ کی جو ملت

کے غم سے رنجور تھا، غمخواری فرما، اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلب حزیں کو مسرور کر۔

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لئے ایک نیا پیام لایا تھا۔ وہ توحید خالص کا پرستار، دین کامل کا علمبردار، اور تجدید ملت کا طلبگار تھا، اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا، اور اس کی آنکھیں جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشک بار رہتی تھیں۔ اس نے مستقبل اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب کی تعمیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

کہنے کو تو ہم میں ملت کے غمخواروں کی کمی نہیں، اور نہ امت کے دوستداروں کی قلت، مگر واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصہ میں دو ہی سچے مسلمان غمخوار پیدا کئے، ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم، دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو، ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا، اور رسول رحمت صلعم کے ساتھ سچا عشق، نئے زمانہ کی جھوٹی آب و تاب اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں۔ آفتاب اسلام کی ضیا باری کے مقابلہ میں اُن کے سامنے جدید تہذیب و تمدن اور زمانہ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی، خدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے۔

اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی بیسویں صدی کے اس پیغام رساں نے اپنے اڑتیس برس کے شاعرانہ پیغاموں نے ملت

کے نوجوانوں میں نئی اُمنگ بھر دی، اور نئے سفر کے قطعِ منزل کے لئے ان میں نئے سرے سے ہمت پیدا کر دی، اقبال کا یہ دعویٰ حرف حرف سچا تھا ۔

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یادرہیں گی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ رہے گا، ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، نظریئے اُن سے بنیں گے۔ ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی دلیلیں ڈھونڈھی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا۔ اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا، اور اقبال زندۂ جاوید۔

اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں، یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چین۔ بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا، یعنی بادۂ انگور کو نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا،

وفد کابل جن تین ممبروں سے بنا تھا، افسوس ہے کہ اس میں یکے بادیگرے دو چل دیئے، سر راس مسعود اور اقبال، اب صرف ایک رہ گیا ہے، اور معلوم نہیں کہ وہ کتنے دن کے لئے ہے، آہ!

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا، جب ہنوز ان کی

شاعری کے مُرغِ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کئے تھے، چنانچہ انہوں نے پیشنگوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں ہوں گی ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پُر ہو جائے گی، افسوس کہ آج اڑتیس برس کے بعد وہ کرسی خالی ہو گئی اور اب اس کے بھرنے کی کوئی صورت نہیں۔

اقبال ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا دانا اقبال، کاروانِ ملّت کا رہنما اقبال! رخصت، رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک و رحمۃ الی یوم التلاقی!

ربیع الاول ۱۳۵۷ھ، مئی ۱۹۳۸ء

سیّد سلیمان ندوی

خواجہ حسن نظامی

آپ ۱۳۰۱ھ میں مقام دہلی بستی حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی درگاہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید عاشق علی بابا فرید گنج شکرؒ کے خاندان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ پہلے خواجہ صاحب کا نام مقام علی رکھا گیا پھر علی حسن لیکن آپ حسن نظامی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابھی آپ بارہ سال کے نہیں ہوئے تھے کہ آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے چار ماہ بعد والد بھی چل بسے۔ مرتے وقت باپ نے وصیت کی تھی کہ "بیٹا محنت مزدوری کر کے حلال کی روزی کمانا" اٹھارہ سال کی عمر میں خواجہ صاحب کی عربی فارسی اور اردو کی تعلیم ختم ہوئی —— ادبی زندگی کا آغاز یوں ہوا کہ ایک روز ایک آدمی نے انہیں ایک اخبار دیا۔ یہ ابھی تک اخبار سے واقف نہ تھے، پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور تہیہ کر لیا کہ اب میں بھی مضمون لکھا کروں گا باپ کی وصیت یاد تھی، گھر کا بار زیادہ تھا، کتاب فروشی شروع کر دی، مضمون نگاری کا شغل بھی جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ ان کے مضامین رسالوں اور اخباروں میں چھپنے لگے۔ دنیا آپ کے نام سے واقف ہو گئی۔ ادب اردو دفتر کو ایک البیلا انشاپرداز مل گیا

خواجہ صاحب کی سب سے پہلی تصنیف "مفلس کا محبوب علاج" تھی۔ خواجہ صاحب کی طبیعت ندرت پسند ہے جس پر غرابت کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً کم ٹوموت۔ فرام قبر ٹو شملہ۔ خدائی انکم ٹیکس۔ طمانچہ برخسار یزید وغیرہ کتابوں کے نام کتنے عجیب و غریب ہیں —— خواجہ صاحب کا طرز تحریر سب سے انوکھا اور سب سے نرالا ہے۔ ان کی نثر میں سادگی کے ساتھ ساتھ مٹھاس بھی ہے۔ اپنے مخصوص دل آویز اچھوتے انداز بیاں میں خیال سے خیال پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ غدر دہلی کے افسانے تو اس درد سے لکھے ہیں کہ پڑھنے والا دل تھام کر رہ جاتا ہے۔ خواجہ صاحب کی طرز تحریر کی دشمن تک تعریف کرتے ہیں۔ افسوس ادب اردو کا یہ آفتاب ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

دہلوی تاجدار کا ایک کُنبہ

جب دہلی ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی۔ اُنہی دنوں کا ذکر ہے کہ میرزا سلیم بہادر جو ابوظفر بہادر کے بھائی تھے اور غدر سے پہلے ایک اتفاقی قصور کے سبب قید ہو کر الٰہ آباد چلے گئے اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے اپنے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں زنان خانہ سے ایک لونڈی باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ میرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے اور تھوڑی دیر میں مغموم واپس آئے۔ ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا "خیر باشد مزاج عالی مکدر پاتا ہوں" میرزا نے مسکرا کر جواب دیا نہیں کچھ نہیں بعض اوقات اماں خواہ مخواہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کے وقت تنھن خاں گویا گا رہا تھا اور میرا دل بہلا رہا تھا۔ اُس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کرتی ہیں۔ اُن کو یہ شور وغل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان رمضان گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اس تفریحی عادت کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا مگر اس پابندی سے جی اُلجھتا ہے حیران ہوں کہ یہ سولہ دن کیونکر بسر ہوں گے۔

مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد تشریف لے چلا کیجیے۔ خدا کے دن ہیں خدا والوں کی بہار بھی دیکھیے۔ مرزا نے



خواجہ حسن نظامی

اردو کا البیلا انشا پرداز

اس صلاح کو پسند کیا۔ وہاں جاکر عجیب عالم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں اور قرآن شریف کے دَور ہو رہے ہیں اور مسجد میں چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے۔ مرزا کو یہ نظارہ بہت پسند آیا۔ اتنے میں افطاری کا وقت نزدیک آیا اور سینکڑوں خوان افطاری کی مکلف چیزوں سے آراستہ آ گئے۔ ان کے رنگ برنگ کے ریشمی خوان پوش اور ان کی مقیشی جھالریں عجیب بہار دکھاتی تھیں۔

مرزا کے دل پر اس دینی چرچے اور شان و شوکت نے بڑا اثر ڈالا اور اب وہ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔ میرزا سلیم کے ایک بھانجے میرزا شہ زور نوعمری کے سبب اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا جو آج خواب وصال کی طرح یاد آتا ہے اور ایک وقت آیا کہ دہلی زیر و زبر ہو گئی۔ اور قلعہ برباد کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک دفعہ ماہِ رمضان شریف میں جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولھے بنے ہوئے ہیں سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں۔ گھوڑوں کے دانے دلے جا رہے ہیں۔ گھاس کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ جب مسجد واگزار ہو گئی تو رمضان ہی کے مہینے میں پھر وہاں جانا ہوا تو دیکھا کہ چند مسلمان میلے کچیلے پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے تھے۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں اور دال سیو بانٹ دی۔

ایک دن میرزا شہ زور نے میرے اصرار پر اپنی درد بھری کہانی اس طرح سنائی:۔

"جب انگریزی توپوں نے، کرچوں اور سنگینوں نے، حکیمانہ جوڑ توڑ نے، تخت پر قبضہ کر لیا اُس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ، کم سن بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لے کر اور اُجڑے قافلہ کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔ ہم لوگ دو رتھوں میں سوار سیدھے غازی آباد کا رُخ کیا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر تمام رات آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا۔ اور سب سامان لوٹ لیا۔ مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ لق و دق جنگل میں عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی، ایک بڑھاپے سے لاچار۔ دو قدم چلنا دوبھر، دوسری بیمار اور حاملہ۔ کبھی پیدل چلنے کا موقع نہیں ہوا۔ تیسری دس برس کی نادان لڑکی۔ عورتیں بین کر کر کے روتی تھیں اور میرا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ آخر مجبوراً میں نے عورتوں کو دلاسا دیا۔ اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آتا تھا۔ غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ القصہ بہزار دقت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے۔ یہ گاؤں مسلمان میواتیوں کا تھا۔ اُنہوں نے ہماری خاطرداری کی۔ اور اپنی چوپاڑ میں ہمیں ٹھہرایا۔ لیکن کب تک یہ بار اُٹھا سکتے تھے، اُکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ "میاں چوپاڑ میں ایک برات آنے والی ہے۔ تو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن نٹھالی (بے کار) بیٹھے کیا کرے ہے کچھ کام کیوں نہیں کرتا" میں نے کہا "بھائی جہاں تم کہو گے وہیں جا پڑیں گے۔ جب فلک نے عالی شان محل چھین لیے تو اس کچے مکان پر

ہم کیا گزر کریں گے اور مجھے کوئی کام بتاؤ ہو سکے گا تو آنکھوں سے کروں گا۔" ان کا چودھری بولا "ہمیں کیا خبر کہ تو کیا کام کر سکے ہے؟" میں نے جواب دیا کہ۔" میں سپاہی زادہ ہوں فنونِ جنگ کے علاوہ کوئی کام نہیں جانتا۔" گنوار ہنس کر کہنے لگے "بابا یہاں تو ہل چلانا ہوگا۔ گھاس کھودنی ہوگی۔" اس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مجھے روتا دیکھ کر گنواروں کو رحم آگیا اور بولے۔" اچھا تو کھیتوں کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں، فصل پر تجھ کو اناج دلایا کریں گے، جو تجھ کو برس دن کو کافی ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ سارا دن کھیت پر جانور اُڑایا کرتا اور گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینہ آیا۔ گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا۔ ہم کو دواؤں کی عادت تھی۔ وہاں دوائیں کہاں سخت تکلیف اُٹھائی اسی حالت میں ایک دن اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہوگیا۔ چونکہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا ہماری عورتوں کی چارپائیاں غرقاب ہوگئیں اور عورتیں چیخیں مارنے لگیں۔ آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بلیوں میں دو چارپائیاں اڑا کر عورتوں کو ان پر بٹھایا۔ پانی گھنٹہ بھر میں اُتر گیا۔ مگر غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔ پچھلی رات میری بیوی کے دردِ زہ شروع ہوا۔ اندھیرا گھپ۔ مینہ کی جھڑی، کپڑے سب گیلے، آگ کا سامان ناممکن۔ مریضہ کی حالت نازک ہوگئی۔ تڑپنے لگی۔ اور تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔ بچہ پیٹ ہی میں رہا۔ صبح کے وقت گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو اُنہوں نے کفن وغیرہ منگوا دیا۔ اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گورِ غریباں میں ہمیشہ کے لیے جا سوئی۔

اناج سب بھیگ گیا تھا۔ بے چارے گاؤں کے چودھری نے ایک روپے کا آٹا قطب صاحب سے منگوا دیا۔ نصف کے قریب خرچ ہوا تھا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا' رمضان کا چاند دیکھ کر والدہ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہوگئیں۔ کچھ دن تو آرام سے گزر گئے۔ لیکن جب آٹا ختم ہوگیا تو سوال کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ پاس کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا بھوک کے مارے کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ تکلیف بیان کرکے رویا کرتی تھیں۔ مگر آج وہ بڑے اطمینان سے خاموش تھیں۔ چھوٹی بہن کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میرے دلاسا دینے پر نڈھال ہوکر چارپائی پر جا پڑی دوسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا اور فاقے میں روزہ در روزہ رکھا۔ شام کے قریب چودھری کا آدمی دودھ اور میٹھے چاول لایا اور بولا "آج ہمارے ہاں نیاز تھی یہ اُس کا کھانا ہے۔ اور پانچ روپے زکوٰۃ کے ہیں۔ ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ میں بکری دیا کرتے ہیں۔ مگر اب کے نقد دے دیا ہے"۔ یہ کھانا اور روپے مجھ کو ایسی نعمت معلوم ہوئی۔ گویا بادشاہت مل گئی۔ اور خوشی خوشی سارا قصہ والدہ کو سُنایا۔ مگر میں نے دیکھا کہ والدہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ باوجود فاقہ کی ناتوانی کے تیور بدل کر کہا "لعنت ہے تیری غیرت پر' خیرات اور زکوٰۃ لے کر آیا ہے۔ اور خوش ہوتا ہے۔ ارے اس سے مرجانا بہتر تھا۔ اگرچہ ہم مٹ گئے مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے۔ صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں"۔

والدہ کی باتوں سے مجھے پسینہ آگیا اور شرم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ چاہا کہ اُٹھ کر یہ چیزیں واپس کر آؤں۔ مگر والدہ نے روکا اور کہا کہ "خدا کو ہی یہ منظور ہے تو ہم کیا کریں۔ سب کچھ سہنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر روزہ کھولنے کے بعد ہم نے مل کر یہ کھانا کھایا اور پانچ روپے کا آٹا منگوالیا۔ رمضان خیر و خوبی سے گزر گیا۔

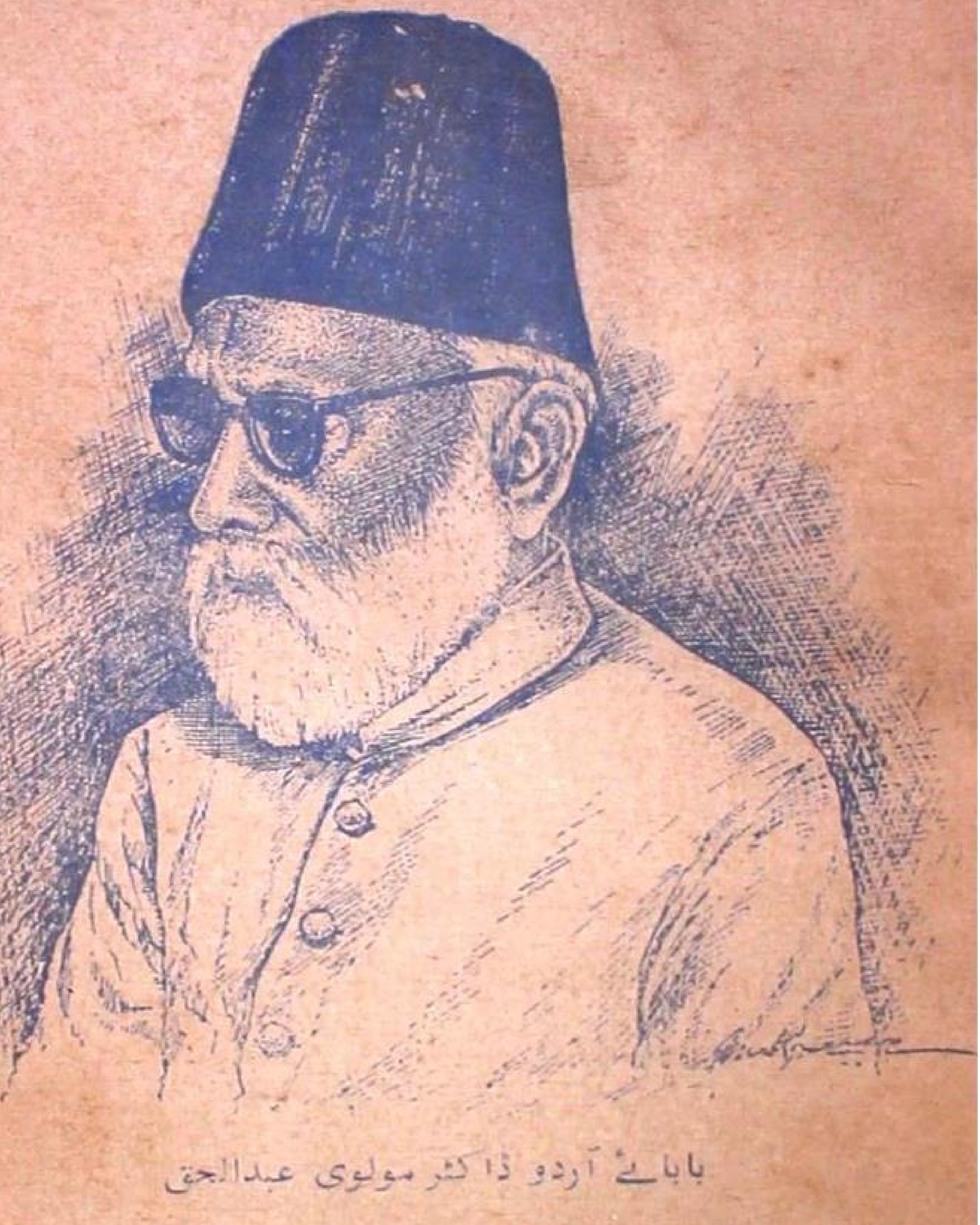
اس کے بعد چھ مہینے اور گاؤں میں رہے اور پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر والدہ کا تو انتقال ہو گیا۔ اور بہن کی شادی کر دی۔ انگریزی سرکار نے میری بھی پانچ روپے ماہوار پنشن کر دی۔ جس پر آجکل زندگی کا انحصار ہے۔

خواجہ حسن نظامی

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

مولوی صاحب کا وطن مالوف ہاپڑ ہے۔ آپ نے ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کالج سے بی اے کیا اور رسالہ "افسر" جاری کر کے اپنی قومی زبان اُردو کی خدمت کا مقدس فریضہ ادا کرنے لگے۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اُردو کے اعزازی معتمد مقرر ہوئے۔ قدیم دکنی ادب کو روشناس کرانے، شعرا کے کلام کے صحیح نسخے شائع کرنے اور تنقید نگاری کا حق ادا کرنے سے آپ نے لازوال شہرت حاصل کر لی ہے جو اُردو ادب کی ہر محفل کو مشام عطر بنائے ہوئے ہے۔ ۱۹۲۱ء سے رسالہ اُردو آپ کی ادارت میں بڑی آب و تاب سے نکل رہا ہے اور اُردو ادب کو مالا مال کر رہا ہے۔ مولوی صاحب اُردو زبان کے ایک زبردست خادم ہیں۔ مسلم یونیورسٹی نے انہی خدمات کے اعتراف میں انہیں ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی ہے۔

مولوی صاحب کی زبان، بول چال کی زبان سے قریب تر ہے۔ ان کے طرز میں سادگی و خلوص حد درجہ نمایاں ہے۔ ان کے قلم سے زیادہ تر ایسے الفاظ نکلتے ہیں جو کثیر الاستعمال ہیں۔ عام فہم اور صاف ستھرے انداز میں محاوروں سے بچتے ہوئے ادب و انشا کی خوبیوں کو برقرار رکھنا انہیں کا کام ہے۔ وہ ظرافت کی ہلکی چاشنی سے عبارت کو مزے دار بنا دیتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کو حتی الامکان منہ نہیں لگاتے۔ ان کی "قواعد اُردو" آپ اپنی نظیر ہے



بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

"آکسفورڈ ڈکشنری" کے نمونہ پر انگریزی اُردو ڈکشنری کا ترتیب دینا آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اُردو ادب میں مولوی صاحب نقاد، لغت نویس، انشا پرداز اور مقدمہ نگار سب ہی کچھ ہیں۔ یہی خوبیاں ہیں جن کی بنا پر ادبی دُنیا انہیں "بابائے اُردو" کے واجب الاحترام لقب سے یاد کرتی ہے۔ اُردو زبان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے ان کے لئے ۵۰۰ روپے ماہوار کا وظیفہ تاحین حیات مقرر کیا ہے۔

انسانیت و درندگی

لومڑی: آہا! خالہ بلی یہ کیا جاتی دنیا دیکھی کہ ادھر قدم رنجہ فرمایا تم تو انسانوں میں ایسی گھُل مل گئیں کہ ہم غریب جانوروں کی طرف بھول کے بھی رُخ نہیں کرتیں۔

بلی: بوا! یہ تم کیا کہتی ہو، ان انسانوں سے تو ہم غریب جانور ہی کچھ اچھے ہیں، مجھے تو ان کی صحبت سے نفرت سی ہوتی جاتی ہے۔

لومڑی: کیوں خیر تو ہے آج تو تم عجیب اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہی ہو کیا کسی سے لڑ کے آئی ہو۔

بلی: (مسکرا کے) بھلا اس بڑھاپے میں میں کسی سے کیا لڑوں گی، تم جانتی ہو کہ میری تین پشتیں انہیں انسانوں کے ساتھ رہتے سہتے گزری ہیں لیکن جوں جوں مجھے ان کے حالات سے زیادہ واقفیت ہوتی جاتی ہے میری بدگمانی اور بڑھتی جاتی ہے بعض اوقات جب میں تنہائی میں بیٹھ کے سوچتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے

کہ ان انسانوں کو ہم پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے، خیر انسان اپنے تئیں ہم سے افضل سمجھیں تو سمجھیں مگر یہ بدنصیب جانور بھی تو ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر جہاں تک میں نے اس پر غور کیا ہے حقیقت اس کے خلاف ہے۔

لومڑی: ۔تم تو اس بڑھاپے میں روز بروز فلسفی ہوتی جاتی ہو اور کیوں نہ ہو آخر تم اس خاندان سے ہو جس کی کسی زمانے میں پوجا ہوتی تھی اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ صحبت ملی تو حضرت اشرف المخلوقات کی۔

بلّی : (قہقہہ لگا کے) ہا ہا! اشرف المخلوقات انسان اور اشرف المخلوقات ارذلِ مخلوقات کہو، ارذلِ مخلوقات۔

لومڑی: ۔آج تو بیڈھب تمہارا مزاج بگڑا ہوا ہے میں تو بے شک اب تک یہی سمجھتی ہوں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور ہم بے عقل ناکارہ ذلیل ادنیٰ جانور ہیں۔

بلّی : ۔بیشک اس سے زیادہ بے عقلی کیا ہوگی کہ تم انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتی ہو انسان اپنے منہ سے میاں مٹھو بنا کرے مگر تمہاری عقلوں پر کیا پتھر پڑ گئے کہ تم بھی اُسے اشرف و افضل سمجھنے لگیں بڑا رونا تو یہی ہے۔

لومڑی: "سمجھنے لگیں کی بھی ایک کہی! کیا وہ درحقیقت اشرف المخلوقات نہیں ہے۔

بلّی : کیسے۔

لومڑی: ۔کیسے تم اُن کی مصاحب انیس و جلیس ہو یہ باتیں مجھ سے کہیں بہتر جانتی ہو لیکن آنکھیں میری بھی ہیں اتنا میں بھی دیکھتی ہوں کہ آج وہ اس عالم کا بادشاہ

اور حاکمِ مطلق العنان ہے، وہ روئے زمین پر اس طرح چھایا ہوا ہے جیسے درخت پر آکاس بیل۔ اس کے سامنے شیر کی شیری، ہاتھی کی مستی، تیندوے کی خونخواری، لومڑی کی عیاری گرد ہے، وہ دور سے ہی کھڑے کھڑے ایسی ٹھائیں سے آواز کرتا ہے کہ حضرت جنگل کے بادشاہ بعیں کر کے زمین پر دراز ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو کبھی اس کے گھروں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن سُنا ہے کہ وہ بڑے بڑے عالی شان محلوں میں رہتا ہے ایسے ایسے نفیس کھانے کھاتا ہے کہ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آتے جو رستہ ہم مہینوں برسوں میں طے کرتے ہیں وہ گھنٹوں میں طے کر لیتا ہے وہ زمین کو کھود کر پتال تک پہونچا اور آسمان پر تھگلی رگاتا ہے وہ لق و دق صحراؤں اور خوفناک جنگلوں اور طوفان خیز سمندروں کو اس طرح طے کرتا ہے جیسے کوئی چمن میں سیر کر رہا ہو، اس کی صنعت و حرفت اور حکمت اور کارستانیاں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کے سامنے سے جنگل کے شیر اور بیابان کے غول اس طرح بھاگتے ہیں جیسے چیتے کے سامنے سے ہرن یا دھوئیں سے مچھّر غرض اس کی حکومت مُسلّم اور اس کی عقل و حکمت حیرت انگیز ہے۔ بھلا ہمیں اس سے کیا نسبت "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک"

بلّی : میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنی فصیح البیان ہو، تم نے تو انسان کی چرب زبانی کو بھی مات کر دیا۔ لیکن میری پیاری لومڑی! یہ سب خول ہی خول ہے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور، تم اس مظلوم صورت سنگ دل خونخوار درندے یعنی انسان کو کیا جانو، اس میں وہ وہ گُن بھرے ہیں کہ خدا پناہ میں رکھے!

لومڑی: تو میں کسی کے باطن کا کیا حال جانوں تم اس کی چہیتی اور پیاری ہو تمہیں کو معلوم ہوگا۔

بلی: خاک پڑے اس پیار پر میں تو اس کی صورت سے بیزار ہوں۔

لومڑی: آخر کیوں؟ میں بھی تو جانوں کہ اس نے کیا قصور کیا ہے؟ یہ معمہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔

بلی: یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ وہ کیسا ہے خیر تم سے کیا چھپاؤں۔لو۔ اب کان دھر کے سنو:۔ یہ اسرار ہیں اور سب کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ بی لومڑی! تم آبادی سے دور جنگل کے بھٹوں میں رہتی ہو تم اس انسان کو کیا جانو میری تو ساری عمر انہیں میں گزری ہے میں نے اس کے تمام کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھے اس کی باتیں سنیں اور اسے کتابیں پڑھتے سنا ہے جانوروں کا تو کیا ذکر اس نے اپنے بھائی انسانوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنا دیئے۔ ان کی لاشوں سے دریا پاٹ دیے، ان کے خون سے ندی نالے بہا دیے۔ اچھا تم ہی اپنے ایمان سے کہو کہ تم نے کبھی کسی شیر کو شیر کھاتے، کسی تیندوے کو تیندوے کا خون پیتے۔ کسی لومڑی کو لومڑی زہر مار کرتے دیکھا یا سنا ہے۔

لومڑی: ہرگز نہیں! خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔

بلی: اب تم ہی انصاف کرو کہ کہاں کی تہذیب و شرافت ہے۔ اچھا اسے جانے دو یہ سب جانتے ہیں کہ شیر کس پھرتی سے جھپٹ کر ہرن کو دبا لیتا ہے اور پھر اس کا خون پی کر دھوپ میں آرام کرنے کے لیے جا بیٹھتا ہے اس وقت اس کے سامنے ہرنوں کی ڈاریں گزر جائیں تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جب کوئی

جانور دوسرے جانور پر کھانے کے لئے حملہ کرتا ہے تو وہ اپنی حفاظت کے لئے اسے مارتا ہے لیکن یہ حضرت اشرف المخلوقات صرف دوزخ شکم کے بھرنے یا اپنی حفاظت ہی کے لئے دوسروں کو نہیں مارتا بلکہ محض تفریح کے لئے ہزار ہا بیگناہوں کا خون کر ڈالتا ہے۔ اور اس شریف فن کا نام اس نے سیر و شکار رکھا ہے۔ قربان جائیے اس تفریح کے! بات یہ ہے کہ اس کی فطرت میں خونخواری ہے ایک چھوٹا سا بلوا جس کی عمر چار پانچ برس سے زیادہ نہیں ہوتی ایک خوبصورت پھول توڑتا اور بلا وجہ اس کی نازک پتیوں کو نوچ نوچ کر ہوا میں اڑا دیتا ہے جب اس سے بڑا ہوتا ہے تو معصوم پرندوں کے انڈے توڑتا اور ان کے غریب و بیکس بچوں کو گھونسلوں میں سے نکال نکال کر تڑپا تڑپا کے مار ڈالتا ہے اور جب جوان ہوتا ہے تو جنگل کے بے گناہ جانوروں کا شکار کرتا اور ان کو مار کر اس قدر خوش ہوتا ہے جیسے کوئی اقلیم فتح کر لی پھر طرّہ یہ کہ جان لے کر ہی بس نہیں کرتا بلکہ ان کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر اپنے مکان میں بچھاتا اور دیواروں پر لٹکاتا ہے خوب صورت اور نازک پرندوں کو مار کر ان کی کھالوں میں بھُس بھرواتا ہے اور گھروں کی محرابوں اور طاقچوں میں خوشنمائی کے لئے رکھتا ہے اور اُسے اپنے مکان کی آرائش و زینت کہتا ہے یہ ہے انسان کی انسانیت۔

لومڑی: خالہ۔ آج تم نے تو بڑے بڑے اسرار بتائے، توبہ توبہ کسی کو مار کر خوش ہونا کیسی بڑی سنگدلی ہے اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان انسان ہی کو قتل کرتا اور اس کے قتل پر فخر و مسرت کرتا ہے ہم میں بھی ہزار ہا قسم کے جانور ہیں مگر کوئی بلا وجہ کسی کو مار کر خوش نہیں ہوتا چہ جائیکہ اپنے ہم جنس کو خدا

اپنی پناہ میں رکھے۔

بلّی : اجی اور سنو۔ تمھیں ایک نئی بات سناتی ہوں تم نے کبھی دیکھا یا سنا ہے کہ شیر کا غلام شیر ہو، تیندوے کا نوکر تیندوا یا ہاتھی کا نوکر ہاتھی یا بلّی کی باندی بلّی ہو یا کوئی جانور کسی جانور کا غلام ہو۔

لومڑی : یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ تو بالکل ان نیچرل یا خلافِ فطرت ہے۔

بلّی : مگر تمھیں یہ سنکر حیرت ہوگی کہ انسان دوسرے انسانوں کو غلام بناتا اور انھیں بیچتا اور خریدتا ہے یا دوسرے انسانوں کو نوکر یا خدمتگار بنا کر رکھتا ہے اور اُن پر طرح طرح سے حکومت کرتا ہے۔

لومڑی : تم سچ کہتی ہو، یہ موا اشرف المخلوقات کیسا ارذل مخلوقات ہے

بلّی : بس ایک دو ہی باتیں سُن کر تمہارے ہوش و حواس جاتے رہے اس کے کرتوت دیکھو تو جان سے بیزار ہو جاؤ یہ میرا ہی دل و جگر ہے کہ ان کے ساتھ رہتی ہوں اچھا ایک آدھ بات اور سنائے دیتی ہوں۔

لومڑی : انسان کی خونخواری کا حال سُن کر بیشک میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہے۔ اور کوئی کہتا تو میں کبھی یقین نہ کرتی اچھا اور روزنا ئیے۔

بلّی : لیجئے ایک اور عجیب بات سناتی ہوں۔ ہم میں سے کوئی درندہ کسی وجہ سے کسی دوسرے کا دشمن ہو جاتا ہے تو وہ انتقام کے لئے اس پر حملہ کرتا ہے اور مار ڈالتا ہے اس کے بعد وہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور پھر اس کا خیال بھی نہیں کرتا لیکن انسان کی ہر آن انوکھی ہے وہ جوں جوں کسی دوسرے انسان کو دباتا ہے۔ اس کا غصہ اور بڑھتا ہے اور جوں جوں وہ انتقام لیتا ہے اس کے

انتقام کی پیاس اور بڑھتی ہے۔ وہ اپنا انتقام وہیں تک نہیں رکھتا جس سے اسے عداوت ہو بلکہ اس کے عزیز و اقارب سے، یار و آشنا سے نوکر چاکروں سے اس کے ملنے جلنے والوں سے سب سے انتقام لیتا ہے۔ اور اُن کی دل آزاری اور انھیں تکلیف پہنچانے کی فکر میں رہتا ہے۔ بلکہ بعض اقوام ان میں ایسی ہیں کہ انتقام موروثی طور باپ سے بیٹے اور بیٹے سے اس کے بیٹے تک سالہا سال تک برابر پہنچتا ہے اور وہ اسی طرح ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے ہیں اور جنگ و جدل و غارت کا بازار قرنہا قرن تک برابر گرم رہتا ہے تم نے کبھی درندوں میں بھی موروثی عداوت اور انتقام سنا ہے؟

لومڑی: ہرگز نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے لڑے اور لڑ کر فیصلہ کرے تو پھر بھی وہ عداوت خاندان اور قبیلوں میں صدہا سال تک جاری رہے اور برابر دوسرے سے انتقام لیتے رہیں۔ واہ۔ واہ ان انسانوں پر خدا کی مار بیشک یہ ارذل مخلوقات ہیں بس خالہ صاحبہ مجھے معاف رکھو میں ایسے افسانے سُننا نہیں چاہتی ان رحم دل انسانوں سے تو ہم غیر ذی عقل ناپاک درندے اچھے ان کی انسانیت انھیں کو مبارک رہے۔

بلّی: ۔اجی تم نے ان کی مکاری عیاری کے حالات تو سنے ہی نہیں انسانوں میں لومڑی بہت مکار مشہور ہے مگر ان کی مکاری کے سامنے اس بچاری کی کیا حقیقت ہے؟

لومڑی: ۔آہا۔ وہاں میرا بھی ذکر خیر ہوتا ہے۔

بلّی : ہاں آپ کی عیاری تو ان میں ضرب المثل ہے۔

لومڑی : خدا ان موؤں کو غارت کرے مکّار! دغاباز! خونخوار خدا کے لئے خالہ بلّی بس کرو۔ میں اس ظالم ناپاک مخلوق کا حال سننا نہیں چاہتی۔ تعجب ہے کہ تم ان میں کیسے رہتی ہو شاباش ہے تمہارے دل و جگر کو۔

بلّی : بوا لومڑی! اگرچہ وہ مجھ سے پیار اور محبت کرتے ہیں مگر مجھ سے بدگمان بھی بہت ہیں البتہ کتّے کو وہ بہت وفادار اور اطاعت گزار سمجھتے ہیں۔ اس بے غیرت نے ایک ٹکڑے روٹی کے لئے اپنی آزادی اور شرافت انسان کے ہاتھ بیچ رکھی ہے۔

لومڑی : مجھے تو اس موئے کتے سے نفرت ہے۔ خدا اب کو اس خونخوار ناپاک کے پنجے سے نجات دے۔

بلّی : آمین اب بہت دیر ہوگئی ہے لو بوا۔ لومڑی میں اب جاتی ہوں اگر زندگی ہے تو پھر ملوں گی۔

لومڑی : آج تو خالہ بلّی تم نے وہ وحشت ناک باتیں سنائی ہیں کہ میرے اوسان جاتے رہے خدا ہم سب پر رحم کرے۔

بلّی : ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے۔ یہ سمندر میں ایک قطرہ ہے۔

خدا حافظ

ڈاکٹر عبدالحق

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں کرم آباد تحصیل وزیر آباد کے رہنے والے ہیں۔ ۱۸۷۰ء میں کوٹ میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی۔ اے پاس کیا۔ مولوی عبدالحق بھی اُسی زمانہ میں وہاں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد ظفر علی خاں بمبئی گئے اور وہیں مولانا شبلی سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ مولانا شبلی کے مشورہ سے وہ حیدر آباد گئے حیدر آباد میں اُس وقت شعر و سخن کے چرچے تھے اور اُستاد داغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔ ظفر علی خاں شاعری میں اُن سے اصلاح لینے لگے۔ وہ کچھ عرصہ دار الترجمہ سے بھی وابستہ رہے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ لاہور آ گئے اور یہاں سے زمیندار اخبار نکالا۔ جو آج تک جاری ہے۔ ظفر علی خاں کو بجا طور پر "بابائے صحافت" کہا جاتا ہے وہ برِصغیر کے سب سے پُرانے صحافی ہیں اور کتنے ہی بڑے صحافیوں نے اُن کے زیرِ سایہ اپنے لیے ممتاز مقام پیدا کیا۔ ظفر علی خاں سچّے انقلابی ہیں جس کی پاداش میں اُن کی عمر کے کتنے ہی سال جیل میں گزرے اور اُن کے اخبار زمیندار نے جتنی ضمانتیں دی ہیں کسی اور اخبار نے نہیں ——۔

ظفر علی خاں کا شمار اُردو کے بہترین مترجموں میں ہوتا ہے۔ وہ

ترجمہ میں اصل کی شان کو برقرار رکھتے ہیں - اُردو محاورہ اور روزمرہ پر انہیں بڑی قدرت ہے - ظفر علی خاں عہد حاضر کے سب سے بڑے قادر الکلام شاعر ہیں، سنگلاخ زمینوں اور نادر قافیوں کے تو وہ بادشاہ ہیں۔ نعت گوئی میں آج شاید ہی کوئی اُن کا حریف ہو۔

ایران

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

ہندوستان اور مصر کی طرح ایران کے ایام قدیم پر ایسی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے کہ تاریخ کا روشن ہاتھ اس کا ایک سرا بھی پوری طرح اُلٹ نہیں سکا۔ واقعات کی جستجو میں روایت کو قدم قدم پر ٹھوکر کھانی پڑتی ہے اور روایت بھی جو قیاسات سے حقائق نفس الامری کا کام لینے کی خوگر ہے۔ قوت متخیلہ کی مدد سے ایک خاص حد تک پہنچ کر عاجز ہو جاتی ہے کہ اس سے آگے اسے بھی کچھ نظر نہیں آتا۔

ایرانِ قدیم کے متعلق ہماری معلومات کا ماخذ کچھ تو ان سنگین عمارتوں کے کتبے ہیں۔ جن کے کھنڈر دستبردِ روزگار سے بچ کر ایک مٹی ہوئی عظمت، ایک گزرے ہوئے تجمل کا افسانہ سنانے کے لیے آج بھی موجود ہیں۔ کچھ "ہیرو دوطس زنوفن" اور دوسرے یونانی مورخین کی تصنیفات ہیں۔ جن سے ایران کی قدامت پر خارجی روشنی پڑتی ہے۔ کچھ مجوسیوں کی مشہور مذہبی کتاب

ژند اوستا اور پہلوی زبان کی متعدد تصانیف ہیں جو ساسانیوں کے عہدِ دولت میں سپردِ قلم ہوئیں۔ اس سلسلے میں ممتاز ترین تصنیف "کارنامک ارتخشتر پاپکان" (کارنامہ ارشیر بابکان) ہے جو بانیٔ دولتِ ساسانیہ کے حالات میں چھٹی صدی عیسوی کے خاتمے پر بعہد یزدجرد ثالث مرتب ہوئی۔ فردوسی نے اسی کارنامے پر اپنی معرکۃ الآرا کتاب شاہنامے کی بنیاد رکھ کر دنیا کو شاعرانہ تخئیل اور مورخانہ وقائع نگاری کے ایک دل آویز مرقع سے روشناس کرتے ہوئے سخنورانِ عجم سے اپنے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرایا ہے۔ لیکن اس گوناگوں مواد کے موجود ہونے پر بھی مستشرقینِ فرنگ کی ناقدانہ ژرف نگاہی کو آج تک زردشت کا زمانہ تحقیق نہیں ہو سکا۔ کوئی اس پیشوائے مذہب کا سنِ ظہور مسیح علیہ السّلام سے پانسو ساٹھ سال قبل قرار دیتا ہے۔ کسی کے نزدیک یہ زمانہ ۶۰۰ء قبل از مسیح ہے۔ اور کسی کی رائے میں اس سے بھی چار صدی پیشتر۔ اگر یہ آخری قیاس صحیح ہو تو روایتی تاجدار گشتاسپ جس نے زردشت کی دعوت پر آئین ثنویت قبول کیا آج سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے ایک ایسی مشرقی تہذیب کا علمبردار نظر آتا ہے جو نہ معلوم کتنے قرنوں کے ارتقا سے اسے ترکہ میں ملی تھی۔ اس سے کم از کم اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ روما الکبریٰ کی آبادی سے مدتوں پہلے جب اہرامِ مصر کی سلیں تراشی جا رہی تھیں۔ جب بابل اور نینوا کے کاہن ثابت و سیار کی رصد بندی کر رہے تھے۔ جب آریہ ورت کے رشی ویدانت کے ناخن سے اسرارِ کائنات کی گرہ کھولنے میں مصروف تھے ایران میں ایک شان دار

تمدّن کی بنیاد قائم ہو چکی تھی۔

فردوسی نے سلاطینِ عجم کو چار سلسلوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) پیشدادی۔

(۲) کیانی۔

(۳) اشکانی۔

(۴) ساسانی۔

پہلا سلسلہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیومرث طہمورث دیوبند۔ جمشید۔ ضحاک۔ افریدوں، ان سب کی محض روایتی شخصیتیں ہیں۔ جن کی مافوق الفطرت خصوصیاتِ زمانۂ ماقبل تاریخ کے اس دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ جب انسانی معاشرت جنوں اور پریوں کی آئینہ داری کی محتاج تھی۔

دوسرا سلسلہ بھی جس میں فردوسی کے زورِ قلم نے رستم دستان اور اسفندیار روئیں تن کی صدہا سالہ معرکہ آرائیوں کی تفصیل سے حیاتِ ابدی پھونک دی ہے ایک دلفریب افسانہ ہے۔ جس سے عجمی عظمت کی مجوسی روایات کا زندہ رکھنا مقصود ہے۔ ان روایات پر اگر ہر دو دلس کی تاریخی شہادت کی روشنی میں نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ۵۵۹ء قبل مسیح میں ایران کا فرمانروا سائرس (کرس یا کیخسرو) تھا جس سے پہلے تین اور تاجدار گزر چکے تھے۔ اسی سلسلہ میں دارائے اول نے ۵۲۱ء ق۔م سے ۴۸۵ء ق۔م تک حکومت کی۔ یہ تاجدار اُسی دارا کا پیش رو ہے۔ جس کا مقابلہ سکندر سے ہوا۔ پس تاریخی حیثیت سے کیانیوں کی اگر کوئی اصلیت ہے تو وہ بھی فرمانروا ہیں۔

۳۳۰ ق-م میں اسکندر اعظم کا کشور کشایانہ خروج کیانی سطوت و جبروت کا خاتمہ کر دیتا ہے اور مقدونوی فاتح کی وفات پر وہ شاندار سلطنت جس پر کبھی درفشِ کاویانی لہراتا تھا۔ اس کے جرنیلوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ کچھ مدت ایران میں یونانیوں کا سکہ چلتا ہے۔ لیکن اپنے وقت پر انہیں بھی تخت و تاج سے تورانیوں کے حق میں دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ جو ہندستان سے لے کر شام تک ایک زبردست سلطنت قائم کر لیتے ہیں فردوسی کی تقسیم کو اگر تاریخی مصطلحات کا درجہ دیا جائے۔ تو اشکانیوں کا اطلاق یونانیوں اور تورانیوں پر ایک ساتھ ہو گا۔ جن کا مجموعی دورِ حکومت ساڑھے پانچ سو سال ہوتا ہے۔ مورخینِ عرب نے اشکانیوں کو ملوک الطوائف کہا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ تورانی دور میں سلطنتِ ایران مرکزی حیثیت سے ایک تاج دار کے زیرِ نگیں تھی۔ لیکن سلطنت کے مختلف صوبوں نے خودمختارانہ حیثیت قائم کر لی تھی۔ ملوک الطوائف جب ایک طویل کشمکش میں رومیوں کا مقابلہ کرتے کرتے کمزور ہو جاتے ہیں تو اردشیر بابکان بانیِ دولت ساسانیہ کا اقبال ۲۲۶ء میں انہیں مٹا دیتا ہے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب تاریخ کی پوری روشنی ایران پر پڑنی شروع ہوتی ہے۔ نویں صدی عیسوی کے خاتمے پر اسلامی مورخ یعقوبی نے اپنے اندازِ بلیغ میں یہی نکتہ اس طرح بیان کیا ہے:۔

"ملوکِ عجم سے بہت سی فوق العادت اور بعید از قیاس خصوصیات منسوب کی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک بادشاہ کے کئی منہ اور متعدد آنکھیں تھیں۔

ایک کا چہرہ تانبے کا تھا۔ ایک کے شانوں سے دو سانپ نکل کر انسان کا مغز کھایا کرتے تھے۔ ان بادشاہوں کی عمریں بہت طویل ہوتی تھیں اور ان کے تصرف نے موت کو بنی آدم سے ٹال دیا تھا۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری روایات جنہیں عقل قبول نہیں کر سکتی۔ ان خیالی قصوں اور فرضی افسانوں کی ذیل میں شمار ہونے کے قابل نہیں۔ جو واقعیت اور حقیقت نفس الامری علم ہیں اور نیز ہر طبقہ کے وضیع و شریف رؤسا و دہاقین، ناقلانِ روایت، و اربابِ حکمت ان باتوں کو نہ تو مانتے ہیں۔ نہ ان کا دعوے کرتے ہیں اور نہ ان کا ذکر کرتے ہوئے سُنے جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی رائے میں سلطنتِ ایران کا تاریخی دور صرف اردشیر بابکان کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان تمام روایتی افسانوں سے اعتنا نہیں کیا۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ جو امور، عقل و قیاس سے بونِ بعید رکھتے ہوں۔ ان سے کوئی سروکار نہ رکھیں"۔

البتہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ بدیع الشان سلطنت جس کی بنا اردشیر بابکان نے ڈالی۔ کیانیوں کے زمانے میں سکندر سے پہلے کس قدر وسعت رکھتی تھی اور دارا جو میدانِ جنگ میں شکست کھا کر اور زخموں سے چور ہو کر بھی۔

مجنباں مرا تا نہ جنبد زمیں

(مجھے نہ ہلا جب تک کہ زمیں نہ ہل جائے) کی جلال آفریں تہدید سے سکندر کو اپنے مرتبے کی بلندی کی حسرت ناک یاد دلاتا ہے۔ جہاں کشائی و جہاں بانی کی کن شاندار روایات کا حامل تھا۔ یہ عقدہ اُس کتبے نے حل کر دیا ہے۔ جو دارائے اوّل نے بمقام اصطخر نصب کرایا تھا۔ ایران کے مقبوضات

کی تفصیل جو اس کتبے میں درج ہے اگرچہ اس کے بعض اجزاء کی صحیح
صحیح جغرافیائی تعیین مشکل ہے۔ اور زمانۂ حال کی جغرافی حدود کے لحاظ
سے بظاہر بعض ممالک کے جزو پر بھی کُل کا اطلاق کیا گیا ہے۔ پھر بھی اس
تفصیل سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ حضرت مسیحؑ سے چھ صدی پہلے ایران
کی سیاسی حدود پنجاب سے لے کر یونان اور ترکستان سے چل کر مصر
تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یونانی مورخین کے بیانات بھی اس کی تائید
کرتے ہیں۔

ظفر علی خاں

آغا حشر کاشمیری

آغا حشر ۱۸۷۹ء میں بمقام بنارس پیدا ہوئے آغا محمد شاہ نام رکھا گیا۔ حشر کے والد کا نام آغا غنی شاہ تھا۔ حشر نے جب ہوش سنبھالا تو سرسید کی شہرت کا بازار گرم تھا۔ علوم جدیدہ کی دوکان علی گڑھ میں کھلی ہوئی تھی۔ مگر گاہکوں کا قحط تھا مسلمان، بچوں کو انگریزی تعلیم دلانا کفر سمجھتے تھے! آغا حشر کے والد بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے۔ اس لئے آغا حشر انگریزی تعلیم سے محروم رہے گھر ہی پر معمولی عربی فارسی کا انتظام ہوگیا۔ نوعمری ہی میں گھر کے خشک ماحول سے اکتا کر حشر بمبئی چلے گئے، اور الفرڈ تھیٹریکل کمپنی میں معمولی تنخواہ پر ملازم ہوگئے۔ یہیں سے حشر کی ڈرامہ نگاری کا آغاز ہوا۔ انہوں نے اس کمپنی کے لئے پانچ ڈرامے لکھے جو ملک میں بے حد پسند کئے گئے۔ اس کے بعد جے۔ ایف۔ میڈن کے یہاں گیارہ سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے۔ حشر نے قومی خدمت کے جذبہ میں سرشار ہو کر انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے لئے "شکریہ یورپ" جیسی بلند پایہ نظم لکھی جس کی چھپی ہوئی کاپی ایک ایک اشرفی کو بکی! فلم کے رواج پر حشر نے فلمی ڈرامے بھی لکھے جو بہت کامیاب ہوئے۔ وہ فارسی، ہندی اور بنگالی میں بے تکلف گفتگو کر سکتے تھے، اردو زبان پر قدرت حاصل تھی۔ ہر وقت ایک منشی ساتھ رہتا تھا کبھی کبھی دو دو منشیوں کو اپنے پاس بٹھا لیتے اور ایک ہی وقت میں دونوں کو علیحدہ علیحدہ مضمون لکھاتے جاتے تھے مطالعہ کا بے انتہا شوق تھا۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھتے یاد ہو جاتا۔ ان کا سال وفات ۱۹۳۵ء ہے۔

رُستم اور سُہراب

رُستم :- دُنیا کے لئے روشنی، پھولوں کے لئے مُسکراہٹ، پرندوں کے لئے زمزمہ، دریاؤں کے لئے ترنم ریز روانی، سوئے ہوئے قوائے عمل کے لئے بیداری کا پیغام لانے والا آفتاب اُفق مشرق کی پیشانی پر تاج زرافشاں کی طرح چمک رہا ہے کتنا پُر جلال نظارہ! یہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب نہیں۔ ایک نورانی کتاب ہے جس میں دُنیا جاگنے کے بعد اپنے ماضی کے خواب کی تعبیر پڑھ رہی ہے۔ ستاروں کے ملک سے آیا ہوا، ایک نورانی فرشتہ ہے۔ جس سے کائنات کی ہر شے زندگی کی برکتیں مانگ رہی ہے۔ آسمان کی مانند اس زمین پر بھی ہر روز اسی طرح طلوع و غروب کے منظر دکھائی دیتے ہیں۔ انسانوں کی قسمت کا ستارہ اور قوموں کے اقبال کا آفتاب بھی یونہی گمنامی کی رات کا سیاہ پردہ ہٹا کر شہرت کی فضا میں چمکتا، کامیابی کے سُنہرے دنوں پر حکومت کرتا اور آخر دُنیا کی یادداشت اور تواریخ کے صفحوں پر اپنے دھندلے یا روشن نشان چھوڑ کر شام فنا کی تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے۔

دُنیائے بے ثبات میں ہر شے ہے تیز گام
ہر دن کے ساتھ رات ہے ہر صبح کی ہے شام
رنگِ زوال سے ہیں رنگے، گُل بھی خار بھی
دھوکا ہے، اس چمن کی خزاں بھی بہار بھی

(گھوڑے کی پیٹھ سے اُترتا ہے)

آفتاب کی سُنہری کرنوں کے ساتھ چاروں طرف خوبصورتی اور رنگینی بکھری

ہوتی ہے۔ اور پرندوں کے ترانوں پر ہوا ایں رقص کر رہی ہے زمین پر صبح کی روشنی، پھولوں کی خوشبو اور بلبل کے نغموں کا سیلاب بہہ رہا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگل قدرت کا بنایا ہوا، ایک شعر، اور یہ سُرخ زرد پھول اس شعر کے حسین استعارے ہیں۔

(پیار سے گھوڑے کی گردن تھپ تھپاتا ہے)

میرے بچپن کے رفیق! جوانی کے دوست، جنگ کے وفادار ساتھی، وہ دیکھو ہرے بھرے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں تمہارے لئے دُور تک سبز مخمل کا دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ خوشبو میں نہائے ہوئے ہوا کے جھونکے بار بار تمہیں بلانے آرہے ہیں جاؤ ان کی دعوت قبول کرو۔

(گھوڑے کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے)

سردی، گرمی، بھوک، پیاس کی تکلیفوں سے بے پرواہ ہو کر آسمان سے ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح جو فضا میں راستہ بھول گیا ہو۔ دو مہینے سے شکار کے پیچھے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں ——— بس شکار اور سفر دونوں ختم ہوئے ——— تھکے ہوئے جسم کو تھوڑا آرام دینے کے بعد آج ہی ایران روانہ ہو جاؤں گا ———

(ڈھال کا تکیہ بنا کر زمین پر لیٹتا ہے)

نیند، پیاری نیند، تم فطرت کی لاڈلی بیٹی ہو، برکتوں کے ملک کی ملکہ ہو، آرام کی سلطنت کی شہزادی ہو ؎

راہ میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو ٹھکراتی ہوئی
آؤ آؤ مُسکراتی، پھول برساتی ہوئی

روح کو تسکین دو اور جسم کو آرام دو
زندگانی کو خدا کا بہترین انعام دو

دھیرے دھیرے سو جاتا ہے۔ چند تورانی سردار، جو ایران کی سیاحت سے واپس ہو کر اپنے وطن سمنگان کی طرف جا رہے ہیں ——— داخل ہوتے ہیں!)

سردار ۱:- دنیا کے عجائبات میں، تم بھی ایک عجیب چیز ہو! بہشت کو دیکھنے کے بعد بھی کہتے ہو۔ کہ بہشت خوبصورت نہیں ہے!!

سردار ۲:- ہاں۔

سردار ۱:- تب یقیناً تم ایران کے سفر میں آنکھیں ساتھ لے کر نہیں گئے تھے، مجھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ جمشید اور فریدون کی سرزمین میں نہیں۔ کسی شاعر کے خیال رنگین دنیا میں سیر کر رہا ہوں!

سردار ۲:- جس طرح موت اور زندگی، ظلمت اور نور، اہرمن اور یزداں میں ازل سے جنگ ہو رہی ہے اسی طرح قدیم سے ایران اور توران بھی ایک دوسرے کی دشمنی کو اپنی زندگی کا واجب الادا فرض سمجھتے ہیں۔ ہم تورانی ہیں، تورانی کے گلے پر خنجر رکھ دو، تب بھی ایران کی تعریف نہ کرے گا۔

سردار ۱:- تعریف نہ کرے گا! کیوں؟

سردار ۲:- کیونکہ وہ ہمارے وطن کے دشمنوں کا ملک ہے۔

سردار ۱:- ایرانی قوم، تورانی قوم کی دشمن ہے۔ لیکن ایران کے پر عظمت پہاڑ، خوب صورت شہر، شاداب جنگل، پریوں کی زلفوں کی طرح لہرانے،

بل کھاتے ہوئے دریا ہمارے دشمن نہیں ہیں ـــــــــ کیا اس سفر میں تورانی سمجھ کر ایران کے آسمان نے تمہیں اپنے سورج چاند کی روشنی نہیں دی۔ ایران کے چشموں نے تمہاری پیاس نہیں بجھائی۔ ایران کی زمین نے تمہیں بیٹھنے سونے کی جگہ دینے سے انکار کیا؟

تم دشمنی سے اپنے ہونٹوں کو سچ بولنے کی اجازت نہ دو۔ لیکن میں توران کے شہنشاہ افراسیاب کے سامنے بھی بے خوف ہو کر کہہ دوں گا کہ دنیا کا بہشت ایشیا ہے اور ایشیا کا بہشت ایران ہے!

سردار ۲:۔ بس بس، میں ایران کی تعریف میں قصیدہ سننا نہیں چاہتا، تم شاعر نہیں، سپاہی ہو۔

سردار ۱:۔ میں تمہارے جیسا چھوٹا دل، تنگ نظر پست خیال لے کر اس دنیا میں نہیں آیا ہوں۔ اچھے کو اچھا کہنا شاعری نہیں انصاف ہے۔ تم جتنے ایران کے دشمن ہو اس سے زیادہ انصاف اور عقل کے دشمن ہو۔

سردار ۲:۔ تمہارے لفظ زہر کی طرح کڑوے اور چھری کی طرح تیز ہیں۔

(میان سے تلوار نکال کر)

واپس لو، معافی مانگ کر ان لفظوں کو واپس لو، ورنہ اس کا جواب مجھے تلوار سے دینا ہوگا۔

سردار ۱:۔ تو اس جواب کا جواب بھی تلوار ہی کی زبان سے سننا ہوگا۔

(دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں)

سردار ۳:۔ ذرا رک کر یہ کیا! تلوار اور طاقت کا ایسا ذلیل استعمال! کیا

دنیا میں اب ہمارا کوئی دشمن نہیں رہا جو تلوار کو زنگ سے بچانے کے لئے ہم نے آپس ہی میں جنگ شروع کر دی؟ تورانیوں کے پاس حربہ، لشکر، دولت، طاقت، ہمت سب کچھ ہے صرف ایک چیز اتفاق نہیں ہے۔ اسی لئے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی ہر فتح شکست بن جاتی ہے۔ تلواریں پھینک دو ——— ٹوٹی ہوئی محبت کو جوڑنے کے لئے ہاتھ ملاؤ ——— جو قوم، ہمدردی اور اتفاق کے ساتھ ایک دل، ایک خیال ہو کر دنیا میں زندگی بسر کرنا نہیں جانتی، یاد رکھو! اس کی قسمت کے نوشتہ پر دائمی ذلت کی مُہر ہو چکی۔ وہ آزاد دنیا میں غلامی کے لئے پیدا ہوئی ہے اور آخری سانس تک غیر قوم کی غلام رہے گی ؎

گر دلوں میں اتفاق اور خواہشوں میں میل ہے
زندگی کی راحتوں کو فتح کرنا کھیل ہے
کامیابی کے لئے احساس حالت چاہیئے
ایک ہو جاؤ۔ اگر دُنیا میں عزت چاہیئے

(دونوں تلواریں میان میں رکھکر ہاتھ ملاتے ہیں)

سردار ۱:- دوست! ندامت کے ساتھ میں اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں!

سردار ۲:- یہ لڑائی نہ تھی۔ ہماری دوستی نے ایک لحظہ کے لئے تلواروں کی جنگ کا خواب دیکھا تھا۔

سردار ۳:- ہمیں شام ہونے سے پہلے سمنگان پہنچ جانا چاہیئے۔ تلواریں تیز کر چکے، اب قدموں کو تیز کرو۔

(آگے بڑھتے ہیں سوئے ہوئے رستم پر نظر پڑتی ہے)

سردار ۱ :۔ کون! انسان ہے، یا قدرت کے جلال، پہاڑ کی مضبوطی شیر کی ہیبت نے انسان کا جسم اختیار کر رکھا ہے!

سردار ۳ :۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گوشت اور ہڈی سے گھرا ہوا طاقت کا سمند رنیند میں چھاتی پھلا کر دھیرے دھیرے سانس لے رہا ہے!

سردار ۱ :۔ اس کے چہرے کی طرف جتنا دیکھو اتنا ہی تعجب بڑھتا ہے قدرت بھی پیدا کرنے کے بعد مدتوں اسے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی رہی ہوگی!

سردار ۴ :۔ (گھوڑے کو دیکھ کر) وہ دیکھو! ہرن کی آنکھیں، مور کی گردن، گینڈے کی چھاتی، چیتے کی کمر، ہنس کی چال، تمام خوبصورتیوں کو ایک آئینہ میں دیکھنا ہو تو سامنے دیکھو!

سردار ۱ : کیسا شان دار گھوڑا! گویا ہری گھاس پہ جنگل کا بادشاہ گھوم رہا ہے۔

سردار ۲ :۔ اسے باندھ کر سمنگان لے چلو، بادشاہ کو نذر کریں گے۔

سردار ۱ :۔ لیکن یہ چوری ہے!

سردار ۲ :۔ یہ چوری نہیں ہے کیونکہ چور کو سزا ملتی ہے اور ہمیں بادشاہ سے انعام ملے گا۔

(سب جاتے ہیں رستم آہستہ آہستہ بیدار ہو جاتا ہے)

رستم :۔ جس طرح گرمی کی گود میں دم توڑتے ہوئے کھیت، بارش ہونے کے بعد زندہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جاگنے کے بعد سونا اور محنت کے بعد آرام انسان کے جسم میں نئی زندگی اور نئی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔

(اُٹھ کر)

آفتاب شہنشاہ کیکاؤس کے اقبال کی طرح بلند ہوتا جاتا ہے اور اس کی دھوپ سخی کی ہمت کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔

(گھوڑے کو پکارتا ہے)

آؤ! آؤ!! جنگ، سیر، سفر ہر جگہ ساتھ دینے والے دوست، آؤ!! ایران کا راستہ ہماری واپسی کا انتظار کر رہا ہے ــــ نہیں سنا ــــ کہاں ہو ــــ کیا دُور نکل گئے؟ ــــ دیکھوں!

(گھوڑے کی تلاش میں جاتا ہے دو دیہاتی داخل ہوتے ہیں)

دیہاتی ۱: ـ گھوڑا تھا یا خوبصورت طوفان، اس کی نسوں میں لہو کی جگہ بجلی بھری ہوئی تھی۔

دیہاتی ۲: ـ اس کے جسم کے ہر جھٹکے کے ساتھ دو چار زمین پر گیند کی طرح لڑھکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

دیہاتی ۱: ـ اور ہر لات پر دو چار پسلیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

دیہاتی ۲: ـ جب گھوڑا اتنا بہادر ہے تو اس کا مالک کتنا بہادر ہوگا۔ یہ کون آرہا ہے؟ ماتھے پر شکن، بھنوؤں میں کھنچاؤ، آنکھوں میں سرخی، چہرے پر غصہ کی تمتماہٹ، کیا اس جنگل کو اس کے کسی جرم کی سزا دینا چاہتا ہے! ــــ

(رستم واپس آتا ہے)

رستم۔ کہیں دکھائی نہیں دیا کہیں پتہ نہیں ملا کیا میں یہ یقین کر لوں کہ جس طرح انسان کو بڑھاپے میں تندرستی چھوڑ دیتی ہے۔ دوسری جگہ لیاقت سے زیادہ تنخواہ مل جانے پر آقا کو نمک حرام نوکر چھوڑ دیتا ہے۔ مصیبت آنے پر خوشامدی مصاحب اور جھوٹے دوست چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح دنیا سے دغابازی سیکھ کر، آج میرے رخش نے بھی مجھے چھوڑ دیا نہیں نہیں، یہ ناممکن ہے پھر کہاں ڈھونڈوں؟ کس سے پوچھوں؟ آسمان سے پوچھا۔ زمین سے پوچھا، چشمے کی لہروں، ہوا کے جھونکوں، جنگل کے درختوں سے پوچھا، لیکن کوئی جواب نہیں دیتا۔ سب چپ ہیں۔

سنو تو، درختو سنو! تمہارے ہی سبز سایہ کے نیچے، میری زندگی کا سایہ غائب ہوا ہے اسے پیدا کرو، ورنہ اس جنگل میں آگ لگا کر تمہیں دھوئیں اور بربادی میں دفن کر دوں گا ؎

زمین کنیز میری ہے فلک غلام مرا
اجل کی طرح ہے بے رحم انتقام مرا
زمانہ جس سے لرزتا ہے میں وہ رستم ہوں
نہیں سنا ہو تو اب سن لو مجھ سے نام مرا

دیہاتی ۱:۔ یہاں سے نکل چلو، یہ آدمی بھوکے شیر کی طرح خوفناک ہو رہا ہے۔

(بھاگنا چاہتے ہیں۔ رستم انہیں روکتا ہے)

رستم:۔ ٹھہرو ________!

دیہاتی ۲:۔ آپ آگ بگولے کی طرح گرم ہو رہے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے ہو جئے ہم لوٹ کر آتے ہیں۔

رستم :- (زمین پر لات مار کر) میں حکم دیتا ہوں۔ ٹھہرو! (دونوں خوف سے کانپتے ہیں)
تمہیں موت کا حکم نہیں سُنایا گیا، پھر کانپ کیوں رہے ہو؟

دیہاتی ۱ :- جناب، کانپتا کون ہے؟ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اس لئے ٹانگوں کو ذرا سردی معلوم ہوتی ہے!

رستم :- (ڈانٹ کر) تم کون ہو؟

دیہاتی ۲ (گھبرا کر) ہم...... ہم...... آدمی ہیں!

رستم :- (زمین پر لات مار کر) میں کب کہتا ہوں کہ تم گھاس پتھر ہو!
(دونوں خوف سے گر پڑتے ہیں)

دیہاتی ۱ :- گھر سے نکلتے وقت، آج ضرور ہم نے کسی منحوس کا مُنہ دیکھا تھا۔

رستم :- بزدلو! اُٹھو! کھڑے ہو، اور جو پوچھوں، اُس کا جواب دو، اُٹھتے ہو، یا...... (گھونسہ تانتا ہے)

دیہاتی ۲ :- اُٹھو بابا۔ ہم زمین سے نہ اُٹھے تو ہمیں یہ دُنیا ہی سے اُٹھا دیگا۔

رستم :- تم دونوں کہاں رہتے ہو؟

دیہاتی ۱ :- اس جنگل سے تھوڑی دور پر ایک گاؤں میں!

رستم :- تم قریب کے گاؤں میں رہتے ہو؟

دیہاتی ۲ :- جناب ہم دونوں غریب کسان ہیں۔ بادشاہ کے محل میں پیدا نہیں ہوئے، جنت کے لائق نہیں، جہنم میں جانا نہیں چاہتے، پھر گاؤں میں نہ رہیں گے تو کہاں رہیں گے؟

رستم :- تم یہیں کے رہنے والے ہو تو ضرور دیکھا ہوگا ؟

دیہاتی ۱ :- کسے دیکھا ہو گا ؟

رستم :- خبردار! میرے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرنا گلا پکڑ کر اقرار کرو........

دیہاتی ۲ :- مگر گردن توڑنے سے پہلے یہ تو بتا دیجئے کس بات کا اقرار کریں

رستم :- کہ تم نے میرے وفادار گھوڑے کو دیکھا ہے!

دیہاتی ۱ :- ارے تو کیا وہ شیرنی کے دودھ سے پلا ہوا گھوڑا آپ ہی کا

رستم :- ہاں وہ کہاں ہے ؟

دیہاتی ۲ :- تورانی سرداروں کے قبضہ میں۔

دیہاتی ۱ :- وہ اسے گرفتار کر کے اپنے بادشاہ کو نذر دینے کے لئے "سمنگان" لے گئے ہیں۔

رستم :- تو بکتا ہے، جھوٹا ہے، پاگل ہے، ناممکن کو ممکن نہیں بنایا جا سکتا، طوفان زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا، بجلی رسیوں میں نہیں باندھی جا سکتی اس دنیا میں کسی ماں نے ایسا جری اور بے خوف لڑکا پیدا نہیں کیا جو رستم کے رخش نامی گھوڑے کی پیٹھ پر اپنی سواری کا زین کس سکے۔ تیری آنکھوں نے تجھے دھوکا دیا اور تو مجھے دھوکہ دے رہا ہے!

دیہاتی ۲ :- میں نہیں۔ سچ بات کا یقین نہ کر کے آپ خود اپنے کو دھوکا دے رہے ہیں۔

رستم :- تیری سچائی کا ثبوت ؟

دیہاتی ۲ :- ثبوت اور گھوڑا دونوں آپ کو سمنگاں میں ملیں گے !

(چلے جاتے ہیں)

رستم :- سمنگان ! کون سمنگان !! توران کی ایک چھوٹی سی ریاست، زمین کے نقشے میں ایک دھندلا سا نشان، دنیا کے جغرافیہ میں ایک حقیر نقطہ ــــــ

(ڈھال اور گرز اُٹھا کر)

دیکھوں گا، دیکھوں گا سمنگاں، دیکھوں گا کہ تیرے قلعہ کی دیواریں، تیرے بادشاہ کے تخت کے پائے، تیرے بہادروں کے دل اور بازو کتنے مضبوط ہیں؟ اپنے سپاہیوں سے کہہ دے کہ اپنی کمانیں چڑھالیں۔ اپنے ترکشوں میں تیر بھرلیں۔ اپنی تلواروں پر سان دے لیں۔ تیرے آسمان کو لہو کی چھینٹوں سے اور تیری زمین کو لاشوں سے ڈھانک دینے کے لئے رستم آندھی اور طوفان بن کر تیری طرف آرہا ہے۔

اب دُنیا میں فنا کا تاریک سایہ تیری آخری جائے پناہ اور بربادی تیرا آخری ورثہ ہے ؎

بہے گا خون، کہ غصّہ ہے تشنہ لب میرا
کہیں پناہ نہ دے گا تجھے غضب میرا
گھرا ہے شعلوں میں تو بھی، تیرا مقدر بھی
بجھا سکے گا نہ اس آگ کو سمندر بھی

(جوش و خروش کے ساتھ سمنگان کی طرف روانہ ہوتا ہے)

آغا حشر کاشمیری

ــــــــــ

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا صاحب ۱۸۸۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا بدخشاں سے آئے تھے۔ اور اکبر شاہ ثانی کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار میں "مختارِ کل" کی حیثیت سے مقرر تھے۔ فرحت اللہ کی ابتدائی تعلیم دہلی کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہوئی اور سینٹ اسٹیفنز کالج سے بی اے، کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن چلے گئے۔ اول اول تو سررشتۂ تعلیم میں کام کیا۔ پھر سررشتۂ عدالت نے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ آخر میں اسسٹنٹ ہوم سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ حیدرآباد کی ادبی صحبتوں نے مرزا صاحب کے فطری ادبی ذوق کو ابھارا اور آپ کا شوخ قلم مزاح نگاری کے میدان میں اپنی جولانیاں دکھانے لگا۔ آپ نے دیوانِ یقینؔ مرتب کیا اور اس پر ایک زبردست تحقیقی مقدمہ لکھا۔ دیوان نظیرؔ کا مقدمہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ محقق سے زیادہ مزاحیہ مضامین کے بادشاہ ہیں؛ نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی" "آخری وصیت۔ نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر۔ دادا جان کا پارلیمنٹ میں جانا، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" پھول والوں کی سیر"، ایسے مضامین ہیں جو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

مرزا صاحب کا طرزِ تحریر سادہ اور پُرلطف ہے سنجیدہ ظرافت

اتنی رسیلی زبان میں ادا ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس کے مزے کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتا۔ ان کے مضامین ہیں اور دلّی کی ٹکسالی زبان، چستیِ الفاظ، دلکش اندازِ بیان، اس پر سونے پہ سہاگا۔ لطیف ظرافت کی رنگ آمیزی، گویا آسمانِ ادب پر دل فریب شفق چھائی ہے۔ مرزا صاحب کے پانچ مجموعے " مضامین فرحت اللہ بیگ " کے نام سے اب تک بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔

دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہلِ محفل دو زانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے۔
ں ادب سے سب نے گردنیں جھکالیں۔ خواجہ نے بادشاہ سلامت کی غزل
یطہ میں سے نکالی، بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا، اور بلند آواز سے پڑھنا
روع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ
رھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے
سمان تک چھائی ہوئی تھی۔ کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ استاد ان
ن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے منہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کے
فاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے۔ ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم
خودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص

وجد میں جھوم رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی بار مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا لیجیے۔ آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجیے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا، کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب، نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دو دم، لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانیے گا۔ ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی۔ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اس نے دونوں شمعیں لا شامیانے کے سامنے رکھ دیں۔ صاحبِ عالم نے اپنی غزل نکالی۔ اور اِدھر اُدھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا۔ بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملینِ فن کے مقابلہ میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں۔ البتہ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بہ نظرِ اصلاح عرض کرتا ہوں۔

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا — درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
حال کھل جائیں غیر کے سارے — پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا

رد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر — بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
ہ تو ملتا، پر اے دلِ کم ظرف — تجھ کو ملنے کا حوصلا نہ ہوا
شکوۂ یار اور زبانِ رقیب — کھیل ٹھیرا کوئی گلا نہ ہوا
رہو اور مجمعِ اغیار — میرا کیا ہے، ہوا ہوا نہ ہوا

پھر تمہارے ستم اُٹھانے کو
زمزا اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سن کر دل قابو ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے، مگر دونوں کو ان ہی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آ کر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا سبحان اللہ! صاحبِ عالم! سبحان اللہ! واہ کیا کہنا ہے، شعر یوں کہتے ہیں۔ مزہ آ گیا۔ اُستاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے جھک کر سلام کیا۔ اور کہا۔ یہ آپ حضرات کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد فرماتے ہیں ورنہ من آنم کہ من دانم۔ وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ ک جُھک کر سلام کرتے۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار ان کے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا۔ یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دوزانو بیٹھے جھوم

رہے تھے۔ چوب دار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ کہ رکھ دو۔ اس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار کر شمع گل کر دی اور کہا میں بھی کچھ عرض کروں۔ سب نے کہا ضرور فرمایئے۔ انہوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں گاتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہی گل بھی ہی، بلبل بھی ہی، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہی سب کہتے ہیں یوں ہی یوں ہی
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچہ جاناں میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں۔ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا۔ اُدھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اٹھے اور اسی عالم بیخودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی، ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا "واقعی کچھ بھی نہیں"!

ان کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے اور ایسا

شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی۔ اور کونسا شعر بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی انگرکھے کی آستین الٹ۔ ٹوپی اچھی طرح جما اپنے استاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ اُدھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انہوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی "اجازت ہے" مرزا فخرو نے کہا ہاں، میاں سالک پڑھو۔ آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا کچھ الٹا پلٹا پھر ایک بار سنبھل کر کہا، عرض کیا ہے۔

انتہا صبر آزمائی کی ۔۔۔۔ ہے درازی شبِ جدائی کی
نقش ہیں سنگِ آستاں پہ تری ۔۔۔۔ داستاں اپنی جبہ سائی کی
کیا نہ کرتا وصالِ شادیِ مرگ ۔۔۔۔ تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی
کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں ۔۔۔۔ بندے بندے ہیں بو خدائی کی

رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک
آگئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی۔ ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں، اور ایک ایک بندش کی داد ملتی۔ استاد ذوق نے دوسرے شعر پر کہا واہ میاں سالک کیا کہنا ہے۔ سب ہی جبہ سائی باندھتے آئے ہیں۔ تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا۔ کیا روانی ہے۔ سبحان اللہ! حکیم مومن خاں نے کہا۔ میاں سالک یہ جوانی اور یہ مقطع ہیں

یہ بوڑھا مضمون، تمہاری "عمر پارسائی" کو بہت دن پڑے ہیں۔ ابھی سے تو بوڑھوں کی باتیں نہ کیا کرو۔ میاں سالک نے جواب دیا۔ استاد، میں نوجوانی ہی میں بڈھا ہو گیا۔ دیکھئے بڑھاپا دیکھنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں۔ بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا کہ جوان نے۔ ہم نہ رہیں گے پر مضمون رہ جائے گا۔

اہا ہا! زبان کا لطف اٹھانا ہے تو اب ظہیر الدین خاں ظہیر کو سُنئے ابھی تیس بتیس سال کی عمر ہے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ! استاد ذوق کی اصلاح نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ شکل و صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی طبیعت اس بلا کی ہے۔ پڑھنے کی بھی ایک خاص طرز ہے لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے کہیں بہتر ہے۔ ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے ہیں۔ غزل ہوئی ملاحظہ ہو۔

جبیں، اور شوق اس کے آستاں کا ارادہ، اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری واماندگی منزل رساں ہے سُراغ نقشِ پا ہوں کارواں کا
ہمیشہ موردِ برق و بلا ہوں مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا

ظہیر آؤ چلو اب میکدے کو
نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

اور تو اور استادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی

نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بیچارے کے ہاتھ دُکھ گئے ہوں گے۔

جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا۔ اُستادانِ فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں۔ مگر خود اُستاد ہیں۔ اُنہوں نے کسی شعر کی تعریف کی۔ اور اس کی وقعت بڑھائی یہ سُن کہ ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسرے کی نظر سے گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو بھی ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ کو سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو سُنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ذرا انگرکھا درست کیا۔ ٹوپی درست کی انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا۔ اور یہ غزل پڑھی۔

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اس میں محو اور یہ سب سے علیحدہ
آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیئے
جو آفتاب و روشنیِ آفتاب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گُم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

بیباک شیوہ شوخ طبیعت زباں دراز
ملزم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر ضرور
اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی، اس پائے کے عالم شاعر نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہو جاتے ہیں مفتی صاحب کے جتنے شاگرد ہیں، اجید عالم ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کے تلامذہ شاعر

ہیں اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پائے کے مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں کہ گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں، آواز بھی ذرا نیچی ہے لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں، ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے، کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو کیا پختہ کلام ہے۔

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
ایک جان کا زیاں ہی سو ایسا زیاں نہیں

کہتا ہوں اس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہے گی زباں پر زباں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے استاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ اول تو داغ کو سب چاہتے ہیں۔ دل بڑھاتے ہیں۔ اور جانتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی ہندوستان کا چراغ ہوگا۔ دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو استادوں میں جگہ ملی تھی۔ مگر انہوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ استاد بھی قائل ہو گئے۔ سترہ اٹھارہ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی۔ ذرا زبان کی شوخی مضمون

کی رنگینی، طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں — ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن — لطفِ سوز و گداز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں — وہ نشیب و فراز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک — وہ میرے دل کا راز کیا جانیں

جو گذرتے ہیں داغؔ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش شہر وہ الفاظ کی نشست وہ بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ داغؔ کی بھولی بھالی شکل، ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محو حیرت نہ ہو گیا ہو۔ اور کوئی نہ تھا جس کے منہ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صلِ علیٰ کے الفاظ بے ساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہو گئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں کے سامنے پہنچ گئی تو اس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس یکجہتی کے استاد کا کلام سننے کے لئے سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اُنہوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے رکھا۔ ذرا سنبھل کر بیٹھے۔ بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا۔ آستینوں کی چنٹ کو صاف کیا، اور بڑی درد انگیز آواز میں دل پذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ | دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی | آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر | یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اِک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالمِ محویت میں بیٹھے تھے وہ خود بھی اپنے کلام کا مزا لے رہے تھے جس شعر میں اُن کو زیادہ لطف آتا تھا اس پڑھتے وقت ان کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو زلفوں کو انگلیوں میں بل دے کر موڑنے لگے، کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مُسکرا دیے پڑھنے کا طرز بھی سب سے جُدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے۔ ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں الفاظ کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعراء نے تعریف کی۔ سُن کر مسکرائے اور کہا آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر کچھ | تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں اپنی بھیرویں الاپتا ہوں" یہ کہہ کر ایسے دلکش اور مؤثر لہجہ میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور پُر درد تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی کو مجلس میں اپنا قدرداں نہیں پاتے اور اس لئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ غزل تھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہو گا　　اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

شمع استاد ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ استاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں۔ کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی۔ لوٹتے لوٹتے صبح ہو گئی۔ شبِ ہجر کا مزا آگیا۔ اسی کشمکش میں یہ قطعہ ہو گیا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ مرزا فخرو نے کہا اُستاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے۔ غزل پڑھیے، رباعی پڑھیے، قصیدہ پڑھیے۔ قطعہ پڑھیے، غرض جو دل چاہے پڑھیے، ہاں کچھ نہ کچھ پڑھیے ضرور۔ استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے اور یہ قطعہ ایسی بلند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اٹھی، اور ان کے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر　　کہ تھی اِک اِک گھڑی سو سو مہینے

نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر　　مرے بختِ سیاہ کی تیرگی نے

تپ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم　　اور آتے تھے پسینوں پہ پسینے

یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے ۔۔۔ کہ "او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے ۔۔۔ مری جانب سے تیر مے دل میں کینے
سوا اس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم ۔۔۔ ارے ظالم تیری کینہ وری نے"
مری سینہ زنی کا شور سن کر ۔۔۔ پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا ۔۔۔ مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی ۔۔۔ طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات ۔۔۔ یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو ۔۔۔ پڑھی یٰسین سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی ۔۔۔ لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے ۔۔۔ اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر ۔۔۔ کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
مؤذن مرحبا بر وقت بولا ۔۔۔ تری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر مسجد سے آواز آئی۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اس کے ساتھ ہی سب کے منہ سے نکلا۔ "تری آواز مکے اور مدینے" اذاں ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے، دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا۔ صاحبو! کچھ عجب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے مشاعرہ شروع ہوا تھا اور فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر ان کے سامنے آ گئی تھیں بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی "حضرات! مشاعرہ ختم ہوا"

(مرزا فرحت اللہ بیگ)

سید سجاد حیدر یلدرم

سید صاحب ۱۸۸۰ء میں بمقام نہٹور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ اُردو فارسی گھر ہی پر پڑھی۔ انگریزی کے لیے علی گڑھ آ گئے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کا شمار اچھے لکھنے والوں میں ہونے لگ گیا تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے مشاعروں کی وہ روحِ رواں تھے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کر لی۔ گورنمنٹ نے تین سال کے لیے بغداد بھیج دیا۔ وہاں ترکی زبان میں کافی ملکہ حاصل کیا۔ واپس آنے پر ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ سنبھالا۔ اسی دوران میں مسلم یونیورسٹی کی پیچیدگیوں اور مشکلات سے متاثر ہو کر رجسٹراری کا بار اپنے سر لیا۔ یہاں سے فرصت ملی تو پھر اپنی جگہ واپس آ گئے اور وقت مقررہ پر پنشن لے کر راجہ محمود آباد کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے۔ ۱۹۴۳ء میں انتقال فرمایا۔

سید صاحب دورِ جدید کے انشا پردازوں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ شعر نما نثر لکھتے ہیں۔ عبارت نہایت دلفریب ہوتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ انہوں نے ترکی سے روحانیت، انگریزی سے شستہ بیانی، اور فارسی سے رعنائی لی ہے۔ انہوں نے اُردو ادب کو پہلی مرتبہ ترکی آب و رنگ سے آشنا کیا۔ ان کے ترکی اور انگریزی ترجمے جو ان کی شہرت کا پیش خیمہ بنے، مخزن کے ابتدائی دور میں چھپ کر

مقبولِ عام ہوئے جب بھی انہوں نے طبع زاد مضامین پر قلم اُٹھایا تو بھی کچھ کم کامیاب نہیں رہے۔ سید صاحب نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ڈرامے بھی۔ جذبات کی مصوری ان کے یہاں نئی نئی ترکیبوں اور خیال آفرینیوں کے گل کھلاتی ہے۔ لطافتِ بیان و شگفتگیٔ خیال ان کا کمال ہے۔

"ثالث بالخیر" "خوارزم شاہ" ترکی سے ترجمہ کرکے اُردو میں منتقل کیے "حکایات و احتساسات" طبع زاد مضامین کا مجموعہ ہے۔ اور "خیالستان" مترجمہ اور طبع زاد ہر دو قسم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ آخری کتاب سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اور اسے سید صاحب کا شاہکار سمجھنا چاہیے۔

سفرِ بغداد

میں نہ بتاؤں گا کہ میں کب اور کیوں اور کہاں سے روانہ ہوا کیونکہ میرے دوست ان تمام باتوں سے واقف ہیں اور جو مجھے نہیں جانتے انہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ میں بغداد شریف جارہا ہوں اور آج کل بصرہ کے اُس خوش سواد زندان میں جسے عرفِ عام میں قرنطینہ کہتے ہیں۔ ہندوستان سے آنے کے جرم میں دس دن کی قید بھگت رہا ہوں۔

۲۶ مارچ ۱۹۰۲ء کو میں اپنے پیارے دوستوں سے کچھ ارمان بھرے اور زیادہ ترحماں بھرے دل کے ساتھ جدا ہوا۔ دوستوں نے جس عنایت اور

محبت سے مجھے خیرباد کہا، اُس کے شکریے کے بجائے شکایت کو دل چاہتا ہے، کیونکہ اس نے جُدائی کے قلق کو صد گونہ کردیا۔

کراچی پہنچتے پہنچتے مجھے احباب اور اعزا کی کشش کئی اور شہروں میں بھی لے گئی ؎

چلا میں وادیِ الفت میں راہ سوزن کی
قدم قدم پہ مجھے ڈوبنے کو چاہ ملے

آخرِ کار ۳۔ اپریل کو جہاز "کولا" پر کراچی سے روانہ ہوگیا۔ موسم نہایت خوش گوار تھا اور سمندر کی جبیں پر ذرا بھی بل نہ تھا اور اگرچہ یہ میرا پہلا سمندری سفر تھا لیکن میں نہیں جانتا کہ سرِ گرانی اور طبیعت کا متلانا کسے کہتے ہیں اور اگر سفرِ بحر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے تو میں عمر بھر سفر کرنے کو تیار رہوں۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ مئی جون میں خلیج فارس کا مزاج برہم ہوتا ہے اور اُس وقت وہ کسی کی نہیں سُنتا۔

۵۔ اپریل کو دو بجے سہ پہر کے قریب مسقط پہنچے، اس مقام کو دیکھ کر طبیعت نہایت مکدر ہوئی، پہاڑ ہی پہاڑ ہیں جن پر درخت کیسا سوکھی گھاس کے ایک پتہ تک کا نشان نہیں اور اس پر حاکمِ مسقط کو دعوئے سلطانی ہے میری رائے میں اگر وہ اپنے تئیں مالکِ دوزخ مسقط کہیں تو نہایت مناسبت ہے۔ شہرِ مسقط پہاڑوں سے گھرا اور خود پہاڑ کے ڈھال پر واقع ہے اور دور سے توخوش نما معلوم ہوتا ہے پکے اور کئی منزل کے مکان ہیں جو سمندر کے کنارے تک چلے آئے ہیں۔ کراچی میں سردی تھی اور آگے چل کر تو مجھے

پوری پوری سردی ملی مگر یہاں ابھی سے وسطِ مئی کا لطف آرہا تھا۔

میں نے چاہا کہ اُتر کر شہر دیکھ آؤں۔ مگر قرنطینہ کے ڈاکٹر نے کسی کو اجازت نہیں دی اور ہم مسقط کو دور ہی سے ڈنڈوت کر کے چھ بجے شام کو روانہ ہو گئے۔ مسقط کے بعد بوشہر تک سمندر ذرا خطرناک تھا۔ مگر میری طبیعت پھر بھی خراب نہیں ہوئی۔ آٹھ اپریل کو آٹھ بجے صبح بوشہر پہنچ گئے۔ یہاں بھی اُترنے کی اجازت نہیں دی۔ دوربین ہی سے شہر کو دیکھا اور کچھ اچھا نہ پایا" سُنا ہے بوشہر کے انگور کھٹے ہوتے ہیں۔"

" مگر میں سمجھتا ہوں کہ آدھا بوشہر تو ہمارے جہاز کے گرد ہی آ گیا تھا۔ ایک صاحب مجسّم قرنطینہ پھرتے تھے، یعنی ان کی ٹوپی پر جلی قلم سے لکھا ہوا تھا " قرنطینہ" جس کے نیچے ایرانی نشان یعنی شیر آگے کے پنجہ میں شمشیر لیے کھڑا تھا مگر صرف ایک کمی تھی وہ یہ کہ خود " قرنطینہ" صاحب کی صورت ڈراونی نہ تھی۔ پھر بھی اُن سے ہمیشہ دس قدم کے فاصلے پر رہا، چار بجے شام کو انہیں بھی خیرباد کہا۔

۹ر اپریل، سات بجے صبح، سبحان اللہ، سبحان اللہ ہم کس خطہ میں جارہے ہیں۔ رات بھر میں کیا طلسم ہو گیا۔ جہاز کے دونوں جانب کیسا دلکش منظر ہے دو طرفہ خرمہ کے درختوں کی مسلسل قطاریں ہیں اور ان کے پیچھے اور نیچے گلاب اور نارنگی اور انار کے درخت ہیں۔ جو پھول اور پھل سے لدے ہوئے ہیں اور جہاں تک نگاہ دوربین کے ذریعہ سے کام کرتی ہے یہ مارے خوشی کے پاگل کر دینے والا منظر ہے۔ اور میں حقیقت میں تھوڑی دیر کے لیے پاگل ہو گیا

تھا - جہاز پر دوڑا دوڑا پھرتا ہوں - کبھی اِس طرف کے منظر کو دیکھتا ہوں اور کبھی اُس طرف کے!

معلوم ہوا کہ ہمارا سفینہ سمندر چھوڑ کے دجلہ اور فرات کے مجموعہ پانی کے سینے پر چل رہا ہے - اور ایک طرف ساحل ٹرکی ہے اور دوسری طرف ایرانی، دجلہ اور فرات کے نام سنے میں عرض نہیں کرسکتا کہ میرے دل پر کیا اثر کیا - آہ! تو اب ہم اُن دریاؤں پر ہیں جو اسلامی تاریخ، اسلامی فسانہ، اسلامی ادب، اسلامی شاعری کے ہر صفحہ پر موجزن ہیں -

دجلہ و فرات! دجلہ و فرات!! تو یوں کہیے کہ یہاں منظروں میں سے گزرتے ہیں، اور اُن ساحلوں کو سیراب کرتے ہیں - میں نے سوائے کشمیر کے کسی دریا کا کنارہ اتنی دور تک ایسا سرسبز و شاداب نہیں دیکھا، اور اصل تو یہ ہے کہ جہلم کا کنارہ شاداب ہے آخر ملک کشمیر ہے لیکن دو طرفہ میدان نظر آتا ہے اگرچہ سرسبز میدان ہے - یہاں اس دریا کے کنارے سوائے گھنے اونچے اور سرسبز درختوں اور پھولوں کے آپ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے ہیں - اوپر آسمان ہے نیچے پانی ہے اور دائیں بائیں نظر کو یہ درخت روک رہے ہیں - اور یہ سلسلہ میں سنتا ہوں کہ یہاں سے بغداد تک یعنی چار سو میل تک قائم ہے، آپ کا جہاز ان سبزپوش سنتریوں کے بیچ میں فاؤ سے (جہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے) بغداد تک جائے گا - شاید لوگ خرمے کے درختوں کی اس قدر تعریف سُن کر زیرِ لب مسکرائیں گے - مگر یہ خیال رہے کہ حجاز یا سوڈان کے خرمے کے درخت نہیں کہ چار پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں، اور گرد سینکڑوں میل

تک ریت کا چٹیل میدان ہے یہ عراقین کے نخلستان اور خرمستان ہیں جن کے سایہ میں ہر قسم کے پھل پھول لگے ہیں۔

دو بجے ہم محمرہ پہنچے۔ ایک چھوٹا سا مقام ہے یہاں ایرانی سرحد ختم ہوتی ہے اور یہاں سے دو طرفہ ساحل ٹرکی ہے یہاں بھی وہی "قرنطینہ" کولا برٹش سفارت کے ایک جج ہز آنر بیٹرز ورتھ گیٹ قسطنطنیہ سے بغداد تشریف لے جا رہے تھے۔ جو جہاز ہندوستان سے آتا ہے اس کے مسافروں پر بصرہ میں ایک نہ دو دس دن کا قرنطینہ ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے یہ ترکیب کی گئی تھی کہ برٹش اسٹیم لانچ کا پنٹ محمرہ بھیج دیا گیا تھا، تاکہ وہ محمرہ سے اس میں سوار ہو کر بصرہ جائیں اور کہیں کہ محمرہ سے آرہا ہوں تو ان پر کوئی قرنطینہ نہ ہوگا لیکن وقت یہ آن پڑی کہ محمرہ کے قرنطینہ افسروں نے کہا کہ اگر یہاں اُتریں گے تو پانچ دن قرنطینہ میں رہنا ہوگا۔ آخر کار یہ ہوا کہ لانچ جہاز کے ساتھ ساتھ چلا اور جب ایرانی سرحد سے نکل گئے تو ایک خالی مقام دیکھ کر جہاز کھڑا کیا گیا اور ہز آنر کا میٹ "میں سوار ہو گئے۔ اور باقی ہم سب یوں ہی حیرت سے دیکھتے رہے محمرہ سے بصرہ صرف کوئی تیس پینتیس میل کے فاصلے پر ہے اور ذرا آگے بڑھتے ہی بصرہ کے مضافات شروع ہو جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ وہی ہیں پھول وہی ہیں مگر اب ان میں امرائے بصرہ کے مکانات شروع ہو جاتے ہیں اور ان قدرتی بے جان پھولوں میں انسانی زندہ پھول اور غنچے نظر آنے لگتے ہیں۔ یعنی حسین اور نہایت حسین یہودی آرمین اور خال خال ترک عورتیں لڑکے اور لڑکیاں دوڑ دوڑ کر لب دریا ہمارے جہاز کو دیکھنے آتے ہیں۔ اور ہم

دوڑ دوڑ کے ڈک کے کنارے ان کو دیکھنے جاتے ہیں۔ کاش یہ سلسلہ لا انتہائی ہوتا مگر وہ تو ایک دو گھنٹے ہی میں بصرہ پہنچ گیا اور وہاں سے ساری کشتی میں بٹھا کر ہم سب قرنطینہ پہنچائے گئے۔ ع

زنداں کو چلے مچل مچل کر

مگر حق یہ ہے کہ ہمارا قید خانہ برا نہیں۔ اس کے سامنے دریا کا منظر نہایت عمدہ ہے اور رات دن کشتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہاں گاڑی کا کام کشتی دیتی ہے اس لیے کہ ہر وقت بادبانی وغیر بادبانی اور دُخانی کشتیاں سامنے سے گزرتی ہیں۔ بعض یہودیوں کا جھرمٹ ان کشتیوں میں عمود بجاتا اور عربی گانے جنہیں ہم خاک نہیں جانتے، گاتا سامنے سے گزرتا ہے اور عجیب پر لطف سین ہوتا ہے۔ قرنطینہ کا مکان سیکنڈ کلاس والوں کے لیے خاصے آرام کا ہے اور میں سوائے اس کے کہ تنہا ہوں نہایت آرام سے ہوں، موسم انتہائی پیارا ہے کھڑکی کے سامنے گلاب کا تختہ کِھلا ہے اور مہک رہا ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ ؎

بہشت آں جا کہ آزارے ...

ہائے مار ڈالا کمبخت کس زور سے کاٹتا ہے۔ لکھنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان کی بھنبھناہٹ کی آواز بھی تو نہیں سُنی (ورنہ یہ تو خبردار کر کے کاٹتے ہیں) نباشد، کسے را باکسے (ارے تیری ایسی تیسی پِسّو ہیں کہ قہر خداوندی کا تمام کپڑوں کے اندر گھس گئے اور مارے ددوڑوں کے تمام جسم سوج گیا) کارے (ارے توبہ پھر پیٹ میں کاٹا، اب بجز اس کے کہ تمام کپڑوں

کو آتار ڈالوں، پستوؤں کا مارنا مشکل ہے مچھر تو آسانی سے مار بھی جا سکتے ہیں۔ کل ڈاک جائے گی، مضمون ختم کرنا ضروری ہے اور یہ کاٹ کاٹ کر بیتاب کیے دیتے ہیں) نباشد۔ تو یہ مقام بہشت (ہائے! ہائے!! کیسا کاٹتے ہیں باز آیا اس بصرہ سے اس شدت کے مچھر اور پستو میں نے کہیں نہیں دیکھے) ہے۔

اور یہ خیال رہے کہ مارچ اور اپریل کے بصرہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ ورنہ جون جولائی میں تو بصرہ کا نام لیتے ہوئے بھی زبان پر چھالا پڑتا ہے۔ رہا بغداد تو وہ اس ولایت کا شملہ یا نینی تال یا کشمیر سمجھا جاتا ہے۔ کراچی سے یہاں تک جس شخص سے بغداد کا ذکر آتا ہے مارے تعریف کے اُس کی زبان خشک ہوتی جاتی ہے۔ بغداد کا موسم یوں اچھا، میوے یوں اچھے، پانی یوں اچھا غرض ہر چیز اچھی ہی اچھی ہے!

اور صاف تو یوں ہے کہ جگہ تو سب یہ اچھی ہیں مگر دس دن کا قرنطینہ! خدا کسی کو مصیبت میں نہ ڈالے۔ اب مجھے بھی یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ میں دس دن کی قید (غنیمت تھا کہ قید با مشقت نہ تھی) بھگت چکا ہوں۔ قسمت میں یہ لکھا تھا۔

اب تک منظر ہی دیکھے یا کسی آدمی سے ملا؟ ہاں! کیوں نہیں۔ کراچی سے جہاز تک پہنچتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب زیادہ تر واسطہ ایرانی، عرب، یہودی، ترک اور آرمینوں سے ہو گا۔

جہاز پر میرے ہم کلاس تین صاحب تھے۔ ایک ایرانی، دوار سی؛

ایرانی صاحب کو اوّل تو میں انگریز سمجھا۔ باتیں کرنے سے خیال ہوا۔ چونکہ انگریزی ٹھیک نہیں بول سکتے تھے کہ فرنچ ہیں، بعد میں معلوم ہوا کہ ایرانی ہیں۔ آقا محمد نیازی شیرازی نام ہے، شنگھائی سے آرہے ہیں اور وطن جارہے ہیں۔ شنگھائی میں بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ سُن کر مجھے بہت بڑی خوشی ہوئی حقیقت میں بمبئی کے مسلمانوں کے بعد اگر تجارت میں کوئی مسلمان قوم ہمت سے کام لیتی ہے تو وہ ایرانیوں کی قوم ہے۔ ترکوں کا تو اس میں نام و نشان ہی نہیں، شیرازی اپنے ملک کے شیدا تھے۔ اور ان کے خیالات سننے کے لیے خواہ مخواہ ایران اور ایرانیوں پر اعتراضات کرنے شروع کیے اور مجھے نہایت لطف آتا ہے جب وہ سچے جوش و خروش سے اپنے ملک کی حمایت کرتے ہیں۔

دونوں آرمنی بمبئی میں تجارت کرتے ہیں، اور اپنے وطن بصرہ کو آرہے ہیں۔ جب عربی میں باتیں کرتے تھے تو مجھے مخالفین عربی بہت یاد آتے تھے کہ کاش وہ انہیں دیکھیں اور بتائیں کہ عربی نے ان پر کیا ستم ڈھایا ہے کہ اچھے خاصے انگریز بنے ہوئے تھے۔ یہاں قوموں میں بہت مغالطہ ہوتا ہے، مسلمان عیسائی اور یہودی عبا اور قبا بھی پہنتے ہیں اور بہت سے کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ ترکی ٹوپی سب اوڑھتے ہیں اور تو اور ناموں سے بھی پتہ نہیں چلتا کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔ میرے ساتھی ارمنی جو تھے اُن کے نام یہ تھے، نصراللہ مسیح اور شکراللہ صباغ۔

یہاں ایک اور عجیب بات دیکھی۔ ہمارے ہاں تو انگریز اس بات کو پسند

نہیں کرتے کہ ہندوستانی انگریزی کپڑے پہنیں اور خاصکر یہ کہ انگریزی ٹوپی اوڑھیں۔ یہاں ترک اس بات کے خواہشمند ہیں کہ سب ان کی ٹوپی اوڑھیں چنانچہ یہ دونوں ارمنی انگریزی ٹوپی پہنتے تھے۔ بصرہ پہنچتے ہی ترکی ٹوپی پہننے لگے۔ میں نے پوچھا تو کہا ہم ترکی رعایا ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہاں ترکی ٹوپی پہننا ضروری ہے۔ یہودی عموماً عبا اور قبا پہنتے تھے اور عرب تو بالکل یہی۔ ترک سب یورپین لباس پہنتے ہیں اور اپنے تئیں یورپین سمجھتے ہیں۔ یعنی عربوں، یہودیوں، آرمینوں سے بالاتر۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سرکاری نوکر ارمنی زیادہ ہیں اور ترک کم، اب تک پانچ چھ مقام سے واسطہ پڑا۔ ان میں سوائے احمد ایک کے جو بصرہ کے سول سرجن ہیں باقی سب یعنی ڈاکٹر قرنطینہ و ہیڈ کلرک وغیرہ گریک یا ارمنی ہیں!

(سجاد حیدر یلدرم)

منشی پریم چند

آپ کا اصلی نام دھنپت رائے اور علمی دُنیا میں پریم چند کے نام سے مشہور ہیں۔ ضلع بنارس کے موضع پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم گھر پر اُردو فارسی سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ والد کا انتقال ہونے کے بعد گھر کا سارا بار ان ہی کے سر پر پڑگیا۔ مجبوراً محکمہ تعلیم میں ملازمت کرلی لیکن نجی طور پر مطالعہ جاری رکھا اور کچھ عرصے بعد بی۔ اے بھی پاس کرلیا۔ دوران ملازمت میں ہی ادبی مشاغل سے دلچسپی لینے لگے لیکن ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے ہوا ناول۔ افسانے اور ڈرامے لکھنے اور شائع کرانے لگے۔ ترک موالات کی تحریک پر سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہوگئے اور ہمہ تن ادبی مشاغل میں منہمک ہوگئے۔

پریم چند اُردو کے افسانہ نگاروں میں اپنی آپ نظیر ہیں، وہ سب سے پہلے اہل قلم ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا ان کے افسانے جنوں اور پریوں کے فرضی قصے نہیں بلکہ روزمرہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے سچے واقعات ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے فطری جذبات سانس لیتے اور کروٹیں بدلتے ملتے ہیں۔ پریم چند، جہالت، غربت رسم ورواج، دولت کی غلط تقسیم، مذہب کے نام پر

انسانیت کا خون اور ایسی ہی تمام باتوں کے خلاف تادمِ آخر قلمی جہاد کرتے رہے۔

پریم چند کا طرزِ تحریر شبلی اور آزاد کے طرز کے بین بین ہے۔ چھوٹے چھوٹے شیریں فقرے، نہایت صاف سلیس اور رواں، پھر اس سادگی میں جوش پیدا کرنا صرف ان ہی کا حصّہ ہے۔

زادِ راہ، پریم بتیسی، میدانِ عمل، پردۂ مجاز، گئودان، بیوہ، بازارِ حسن، فردوسِ خیال، آخری تحفہ اور خاکِ پروانہ وغیرہ۔ کتابیں محض اوقات گذاری کے لئے نہیں بلکہ کسبِ فیض کے لئے ہمیشہ پڑھی جائیں گی۔ انسانیت انھیں کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ وہ بہت غیر متعصب شخص تھے۔ اور ان کے مزاج میں رواداری بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔

حجِ اکبر

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ۔ اپنے بچّے کے لئے دایہ رکھنا برداشت نہیں کر سکتے تھے لیکن ایک تو بچّے کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنے برابر والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلّت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچّہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروّت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے یہاں تین سال سے نوکر تھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچّے کی پرورش کی تھی۔ اپنا سمجھ کر دل و جان



منشی پریم چند
افسانوں میں حقیقتوں کا نقش گر

سے کام کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور بلا وجہ کچھڑ نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لئے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملے میں اپنے شوہر سے متفق نہ تھی۔ اسے شک تھا کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے۔ جب دایہ بازار سے لوٹتی تو وہ دہلیز میں چھپی رہتی کہ دیکھوں آٹا کہیں چھپا کر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی چیز کو گھنٹوں دیکھتی، اور بار بار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہو گا؟ دایہ کبھی تو ان باتوں کا جواب ملایمت سے دیتی لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہو جاتیں تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی۔ قسمیں کھاتی، صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔ تردید اور حجت میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی اور روز یہ ڈرامہ دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاکرہ کے شکوک پر آب ریزی کرتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بڑھیا محض بچے کی محبت سے پڑی ہوئی ہے۔ وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبے کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش و خروش سے مناظرہ ہو رہا تھا۔ ان کا مصور طرز ادا، ان کا اشتعال انگیز استدلال، ان کی متشکل تضحیک، ان کی روشن شہادتیں اور منور روایتیں، ان کی تعریض اور تردید سب بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے یا دو شعلے، جو دونوں طرف سے امڈ کر باہم گتھ گئے تھے، کیا روانی زبان تھی، گویا کوزے میں دریا بھرا ہوا، ان کا جوش اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا، ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت، اسلوب کی ایسی جدت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات

کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون سا شاعر ہے۔ جو رشک نہ کرتا صفت یہ بھی کہ اس مباحثے میں تلخی یا دل آزاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت، ان کا ضبط، ان کا اطمینانِ قلب، حیرت انگیز تھا ان کے ظرفِ دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی اور ذہنی مناظرہ تھا، اپنے کمالات کے اظہار کے لئے ایک خالص زور آزمائی تھی، اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لئے تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتذل کنایات اور اشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی، وہ کلمات رکیک جن سے عفونت بھی دور بھاگتی۔ ہزاروں رنگین مزاجوں کے لئے محض باعثِ تفریح تھے،

دایہ بھی کھڑی ہو گئی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے پر تماشا اتنا دل آویز تھا کہ اسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ یکایک نو بجے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی۔ کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جھکا لیا اور بولی: "بی بی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہو گئی اور باتیں کرنے لگی"

شاکرہ اس جواب سے اور بھی برہم ہوئی "یہاں دفتر جانے کو دیر ہو رہی ہے۔ تمہیں سیر سپاٹے کی سوجھی ہے" مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی بچے کو گود میں لینے چلی پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا: "رہنے دو تمہارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔"

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی۔ بیگم صاحبہ کا غصہ فرد کرنے کی اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھالیا، اور دروازے کی طرف چلی۔ لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی "تمہارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ تماشے کسی اور کو دکھایئے یہاں طبیعت سیر ہو گئی"۔

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان، یہ ایسا مضبوط تعلّق تھا جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کر سکتی تھیں۔ اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی سخت زیادتیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا کہ واقعی وہ مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رُخی سے کیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہو سکا، بولی "بی بی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہو گا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہو گی۔ اس پر آپ اتنا جھلا رہی ہیں، صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو، اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے"۔

شاکرہ۔ تو یہاں تمہاری کون پروا کرتا ہے۔ تمہاری جیسی مامائیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

دایہ۔ ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ مامائیں، دائیاں بہت ملیں گی۔ جو کچھ خطا ہوئی معاف کیجئے گا۔ میں جاتی ہوں۔

شاکرہ - جاکر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کر لو۔

دایہ - میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائی منگوا دیجئے گا۔

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آ گئے۔ پوچھا کیا ہے؟

دایہ - کچھ نہیں - بیوی نے جواب دے دیا ہے۔ گھر جاتی ہوں۔

صابر حسین - خانگی تردّدات سے یوں بچتے تھے جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے - انہیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا۔ پر کانٹوں میں پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ چیں بہ جبیں ہو کر بولے "بات کیا ہوئی؟"

شاکرہ - کچھ نہیں - اپنی طبیعت - جی نہیں چاہتا - نہیں رکھتے - کسی کے ہاتھوں بک تو نہیں گئے۔

صابر - تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجھتی رہتی ہے۔

شاکرہ - ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے - کیا کروں - خصلت ہی ایسی ہے تمہیں یہ بہت پیاری ہے تو لے جاکر گلے باندھو - میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔

دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں، دل نصیر کے لئے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچے کو گود میں لے کر پیار کروں۔ پر یہ حسرت لئے اُسے گھر سے نکلنا پڑا۔

(۳)

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازے تک آیا۔ لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تو وہ مچل کر زمین پر لوٹ گیا اور انا انا کہہ کر رونے لگا۔ شاکرہ نے چمکارا پیار کیا۔ گود میں لینے کی کوشش کی، مٹھائی کا لالچ دیا۔ میلہ دکھانے کا وعدہ کیا۔ اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لولو اور ہوّا کی دھمکی دی۔ مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔

یہاں تک کہ شاکرہ کو غصہ آگیا۔ اس نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا اور آکر گھر کے دھندوں میں مصروف ہوگئی۔ نصیر کا منہ اور گال لال ہوگئے۔ آنکھیں سوج گئیں۔ آخر وہ وہیں زمین پر سسکتے سسکتے سو گیا۔

شاکرہ نے سمجھا تھا تھوڑی دیر میں بچہ رو دھو کر چپ ہو جائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر انّا کی رٹ لگائی۔ تین بجے، صابر حسین دفتر سے آئے اور بچے کی یہ حالت دیکھی تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اُسے گود میں اٹھا لیا اور بہلانے لگے آخر نصیر کو جب یقین ہو گیا کہ دایہ مٹھائی لینے گئی ہے تو اُسے تسکین ہوئی۔

مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا "انّا مٹھائی لائی ہے؟"

اس طرح دو تین دن گزر گئے۔ نصیر کو انّا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ بے ضرر کتا جو ایک لمحے کے لئے اس کی گود سے جُدا نہ ہوتا تھا وہ بے زبان بلی جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، وہ طائر بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا۔ سب اس کی نظروں سے گر گئے وہ ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ انّا جیسی جیتی جاگتی پیار کرنے والی گود میں لے کر گھمانے والی تھپک تھپک کر سُلانے والی، گا گا کر خوش کرنے والی چیز کی جگہ، ان بے جان، بے زبان چیزوں سے پُر نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا اور انّا انّا پکار کر رونے لگتا۔ کبھی دروازے پر جاتا اور انّا انّا پکار کر ہاتھوں سے اشارہ کرتا۔ گویا اُسے بلا رہا ہے۔ انّا کی خالی کوٹھری میں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اُسے اُمید ہوتی تھی کہ انّا یہاں آتی ہوگی اس کوٹھری کا دروازہ بند پاتا تو جا کر کواڑ کھٹ کھٹاتا کہ شاید انّا اندر چھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھلتے سُنتا تو انّا انّا کہہ کر دوڑتا۔ سمجھتا کہ انّا آگئی۔ اُس کا

گدرایا ہوا بدن گھل گیا۔ گلاب سے رخسار سوکھ گئے۔ ماں، باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لئے ترس ترس کر رہ جاتے۔ اگر بہت گدگدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی تو ایسا معلوم ہوتا، دل سے نہیں، محض دل رکھنے کے لئے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مصری سے نہ میوے سے نہ میٹھے بسکٹ سے نہ تازی امرتیوں سے، ان میں مزہ تھا جب انّا ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔ اب ان میں مزہ نہ تھا۔ دو سال کا ہونہار لہلہاتا ہوا شاداب پودا مرجھا کر رہ گیا۔ وہ لڑکا جسے گود میں اٹھاتے ہی نرمی گرمی اور وزن کا احساس ہوتا تھا۔ اب استخوان کا ایک پتلا رہ گیا تھا۔ شاکرہ بچے کی یہ حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی اور اپنی حماقت پر پچھتاتی۔ صابر حسین جو فطرۃً خلوت پسند آدمی تھے، اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے، اسے روز ہوا کھلانے جاتے۔ نت نئے کھلونے لاتے۔ پر مرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔ دایہ اس کی دنیا کا آفتاب تھی۔ اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہو کر سبزی کی بہار کیونکر دکھاتا دایہ کے بغیر اسے اب چاروں طرف اندھیرا، سناٹا نظر آتا تھا۔ دوسری انّا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی۔ پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چھپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیونی یا بھتنی تھی۔

عالم وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالم خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی انّا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اس کی وہی گود تھی، وہی محبت، وہی پیاری پیاری باتیں، وہی پیارے پیارے گیت، وہی مزے دار مٹھائیاں، وہی سہانا سنسار، وہی دلکش لیل و نہار۔ اکیلے بیٹھے انّا سے باتیں کرتا۔ انّا کتا بھونکے۔ انّا گائے دودھ دیتی۔ انّا اجلا اجلا گھوڑا دوڑتا۔ سویرا ہوتے ہی جوتا لے کر دایہ کی

کوٹھری میں جانا۔ اور کہنا "انّا دودھ پلا" اپنی چارپائی پر تکیہ رکھ کر چادر سے ڈھانک دینا اور کہنا "انّا سوتی" شاکرہ کھانے بیٹھتی تو رکابیاں اٹھا اٹھا کر انّا کی کوٹھری میں لے جانا اور کہنا "انّا کھانا کھائے گی" انّا اس کے لئے اب ایک آسمانی وجود تھی جس کی واپسی کی اُسے مطلق اُمید نہ تھی۔ وہ محض گزشتہ خوشیوں کی دلکش یادگار تھی۔ جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھی۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بیتابی کی جگہ ایک حسرت ناک توکل، ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ کبھی شدت کی گرمی۔ کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے۔ بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کی نحافت ان موسمی تغیرات کو برداشت نہ کر سکی۔ شاکرہ احتیاطاً اسے فلالین کا کرتہ پہنائے رکھتی۔ اسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی۔ ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی۔ مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا۔ نصیر کھانسی بخار میں مبتلا ہو گیا۔

(۴)

صبح کا وقت تھا۔ نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہو رہا تھا۔ شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینے پر تیل کی مالش کر رہی تھی اور صابر حسین صورتِ غم بنے ہوئے بچے کو پُردرد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اِس طرف وہ شاکرہ سے بہت کم بولتے تھے۔ انھیں اس سے ایک نفرت سی ہوتی تھی وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف سفلہ مزاج بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا: "آج بڑے حکیم صاحب کو بلا لیتے شاید ان ہی

کی دوا سے فائدہ ہو۔ صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر ترشی سے جواب دیا۔

"بڑے حکیم نہیں لقمان بھی آئیں تو اُسے کوئی فائدہ نہ ہوگا؟"

شاکرہ:- تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہوگی؟

صابر:- بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے۔

شاکرہ:- تمہیں تو وہی دھن سوار ہے۔ کیا عباسی امرت پلا دے گی؟

صابر:- ہاں وہ تمہارے لئے چاہے زہر ہو لیکن بچّے کے لئے امرت ہی ہوگی۔

شاکرہ:- میں نہیں سمجھتی کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے۔

صابرہ:- اگر نہیں سمجھتی ہو اور اب تک نہیں سمجھا تو رو دُوگی۔ بچے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

شاکرہ:- چپ بھی رہو۔ کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو۔ اگر ایسی جلی کٹی سنانی ہے تو یہاں سے چلے جاؤ۔

صابر:- ہاں تو میں جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھو یہ خون تمہاری گردن پر ہوگا۔ اگر لڑکے کو پھر تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو بس عباسی کے پاس جاؤ اس کی منت کرو۔ التجا کرو۔ تمہارے بچے کی جان اسی کے رحم پر منحصر ہے۔

شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صابر حسین نے پوچھا: "کیا مرضی ہے۔ جاؤں اسے تلاش کروں؟"

شاکرہ تم کیوں جاؤ گے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔

صابر:- نہیں معاف کرو۔ مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہے، نہ جانے تمہارے

مُنہ سے کیا نکل جائے کہ وہ آتی بھی ہو تو نہ آئے۔

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہ ملامت سے دیکھ کر کہا "ہاں اور کیا بمجھے اپنے بچے کی بیماری کا قلق تھوڑا ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں۔ لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ ہوتا تو میں اُسے کب کی منالائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو لیکن نصیر سے اسے محبت تھی۔ میں آج ہی اُس کے پاس جاؤں گی۔ اُس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کردوں گی اور وہ جس طرح راضی ہوگی اسے راضی کروں گی۔

شاکرہ نے بہت ضبط کرکے یہ باتیں کیں۔ مگر اُمڈے ہوئے آنسو اب نہ رُک سکے۔ صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہو کر بولے۔"میں تمہارا جانا مناسب نہیں سمجھتا میں خود ہی جاتا ہوں۔"

(۵)

عباسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز و شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتیاں گرادیں، بادِ حوادث نے درخت کو پامال کر دیا اور اب یہی ایک سوکھی ٹہنی اس ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پاکر اس سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری بھری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جو اب تک خشک اور پامال تھی اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ اندھیرے بیابان میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک نظر نے لگی تھی۔ اب اس کا دریائے حیات سنگریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب

ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا- اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی- اس میں معنی پیدا ہو گئے تھے-

عباسی نصیر کی بھولی باتوں پر نثار تھی- مگر وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی- اس لئے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو- وہ نصیر کے لئے ماں سے چھپا کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کھلا کر خوش ہوتی- وہ دن میں دو دو تین تین بار اُسے اُبٹن ملتی کہ بچہ خوب پروان چڑھے- وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے- ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی- اُسے نظرِ بد سے بچانے کے لئے تعویذ اور گنڈے لاتی رہتی- یہ اس کی خالص مادرانہ محبت تھی جس میں اپنے روحانی احتظاظ کے سوا اور کوئی غرض نہ تھی-

اس گھر سے نکل کر آج عباسی کی وہ حالت ہو گئی جو تھیٹر میں یکایک بجلیوں کے گُل ہو جانے سے ہوتی ہے- اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی- کانوں میں وہی پیاری باتیں گونج رہی تھیں اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا- اس کال کوٹھری میں دم گھٹا جاتا تھا-

رات جوں توں کر کے کٹی- صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی- یکایک تازہ حلوے کی صدا سُن کر بے اختیار باہر نکل آئی، معاً یاد آگیا آج حلوا کون کھائے گا؟- آج گود میں بیٹھ کر کون چہکے گا؟ وہ نغمۂ مسرت سننے کے لئے جو حلوا کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے، ہونٹوں سے اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا، عباسی کی رُوح تڑپ اُٹھی- وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں نصیر کو دیکھ آؤں- پر آدھے راستے سے لوٹ گئی-

نصیر عباسی کے دھیان سے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں اترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا۔ نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسنوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتی تو نصیر ہی کا ذکر کرتی۔ نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لئے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی۔ اس لئے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی۔ لیکن کبھی آدھے راستے سے لوٹ آتی۔ کبھی دو چار قدم آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون منہ لے کر جاؤں؟ جو محبت کو فریب سمجھتا ہو اسے کون منہ دکھاؤں کبھی سوچتی کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو! بچوں کی محبت کا اعتبار کیا! نئی دایہ سے پرچ گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں پر زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گذر گئے۔ عباسی کا دل ہر دم اچاٹ رہتا۔ جیسے اسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔ گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی، بدنی ضروریات بھی خلاء دل کو پر کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آگئے۔ محلے میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عباسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی۔ جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشے کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ آمادۂ سفر ہو گئی۔

(۶)

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے گھر والوں سے

رخصت ہو رہے تھے چاروں طرف ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی جانے والوں کے دامن پکڑے ہوئے تھی، کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا "دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹر بو دینا۔ اور باغ کے پاس گیہوں" کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا "آسامیوں پر بقایا لگان کی نالش کرنے میں دیر نہ کرنا اور دو روپے سیکڑہ سود ضرور مجرا کر لینا" ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے مال آنے میں دیر ہو تو خود چلے جایئے گا۔ اور چلتو مال لیجئے گا ورنہ روپیہ پھنس جائے گا۔" مگر خال خال ایسی صورتیں بھی نظر آتی تھیں جن پر مذہبی ارادت کا جلوہ تھا وہ یا تو خاموش آسمان کی طرف تاکتی تھیں یا محوِ تسبیح خوانی تھیں۔ عباسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی۔ وہی خرید و فروخت لین دین کے چرچے۔ نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اترتا۔ لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی، یا اللہ کسی طرح گاڑی چلے۔ گرمی کے مارے کلیجہ بھنا جاتا ہے۔ اتنی گھٹا امڈی ہوئی ہے۔ برسنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ معلوم نہیں یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں۔ جھوٹ موٹ اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ یہ نہیں جھٹ پٹ گاڑی چھوڑ دیں۔ مسافروں کی جان میں جان آئے۔ یکایک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لئے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا، ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔ عباسی محض یہ دکھانے کے لئے کہ میں بھی حج کرنے جا رہی ہوں، گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کے قریب آئے اور بولے "کیوں عباسی تم بھی حج کو چلیں؟"

عباسی نے فخریہ بہ انکسار کہا "ہاں یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں،

معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ خدا کے ہاں منہ دکھانے کے لیے بھی تو کوئی سامان چاہیئے۔ نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں۔

صابر۔ اب تو تم جا رہی ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کرو گی۔ اس کے لیے دعا کرتی رہنا۔

عباسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی : "کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے کیا؟

صابر حسین "اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے جس دن سے تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتے تک تو شب و روز ناناّ ناّ کی رٹ لگاتا رہا اور اب ایک ہفتے سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ چل کر تمہاری منت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے تمہیں دیکھ کر اس کی طبیعت سنبھل جائے لیکن تمہارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جا رہی ہو، اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمہارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا تھا کہ اتنی جرأت کر سکوں اور پھر کار ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی، ورنہ مشیت ایزدی سے کیا چارہ ؟"

عبّاسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی "اللہ میری جان کے صدقے میں میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو"۔ رقت سے گلا بھر آیا۔ خیال آیا، میں کیسی سنگدل ہوں بیارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو گیا۔ اور میں اسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بد مزاج

سہی، بدزبان سہی، نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا۔ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشیو۔ پیارا نصیر میرے لئے ہڑک رہا ہے (اس خیال سے عبّاسی کا کلیجہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبّت ہے۔ ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتی اور گھر سے قدم نہ نکالتی۔ آہ! نہ معلوم بچارے کی کیا حالت ہے۔ انداز وحشت سے بولی "دودھ تو پیتے ہیں نہ؟"۔

صابر:۔ تم دودھ کو کہتی ہو اس نے دو دن سے آنکھیں تک تو کھولی نہیں۔

عبّاسی:۔ یا میرے اللہ۔ ارے او قلی قلی! بیٹا آ کے میرا اسباب گاڑی سے اُتار دے۔ اب مجھے حج وج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا جلدی کر۔ میاں دیکھئے کوئی یکّہ ہو تو ٹھیک کر لیجئے ——— یکّہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عبّاسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور یکہ بان سے کہتی تھی "بیٹا جلدی کر میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی" راستے میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اُسے غصّہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا گھوڑے کے پر لگ جاتے۔ لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آگیا تو عبّاسی کا سینہ زور سے اُچھلنے لگا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔ خدا کرے سب خیر و عافیت ہو۔

یکّہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتًہ عبّاسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ مُنہ کو آگیا۔ سر تیورا گیا معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہوں۔ جی چاہا یکّہ سے کود پڑوں۔ مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکے سے بدا[۱] ہو رہی

---

[۱] عربی زبان کا اصل لفظ "وداع" بمعنی رخصت ہونا ہے۔ عوام اسی طرح بولتے ہیں۔

ہے تسکین ہوئی۔

آخرکار صابر حسین کا مکان آپہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔ جیسے[1] کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی[2] بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لئے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر تھی۔

عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منہ کی طرف چشم پرنم سے دیکھ کر کہا "بیٹا نصیر آنکھیں کھولو۔"

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحے تک دایہ کو خاموش[3] دیکھتا رہا۔ تب یکایک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا "انّا آئی انّا آئی۔"

نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ[4] روشن ہو گیا۔ جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جائے ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

---

۱ فطرت کی مصوری ہے۔

۲ یہ افسانہ کا ضروری جزو ہے جہاں تک عام فسانہ نگاروں کی نظر نہیں پہنچی۔

۳ نادان بچوں کی فطرت اسی کی مقتضی ہے۔

۴ مسرت کے آثار پیدا ہونا استعارہ ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کر کے بولے "تمہاری اَنّا کو مار کر بھگا دیں۔"

نصیر نے منہ بنا کر کہا "نہیں[1] روئے گی۔"

عبّاسی بولی "کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا، میرے حج کا ثواب کون دے گا؟"

صابر حسین نے مسکرا کر کہا۔ تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا۔ اس حج کا نام حج اکبر[2] ہے۔

(پریم چند)

---

[1] بچوں کے لئے سب سے زیادہ تکلیف پہنچانے والی بات یہی ہوتی ہے۔

[2] سب سے بڑا حج۔

مولانا ابوالکلام آزاد

محی الدین احمد نام۔ ابوالکلام لقب، ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں علومِ دینی کی تکمیل کرلی۔ ہندوستان آنے کے بعد کلکتہ میں رہنے لگے اور حلقۂ شبلی میں شامل ہوگئے "الہلال" اور "البلاغ" نکال کر اردو صحافت کی دنیا ہی بدل دی ــــ زندگی کا بیشتر حصہ سیاسی سرگرمیوں میں گزرا اور اس سے اردو ادب کو یقیناً بہت نقصان پہنچا۔ الہلال اور البلاغ کے مضامین ہمارے نثری ادب کا بہت ہی قیمتی حصہ بن گئے ہیں آج کل مولانا آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم ہیں۔

ابوالکلام آزاد اُردو کے ممتاز ترین صاحبِ طرز انشاپردازوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی تحریر میں خطابت کا انداز ہر جگہ ملتا ہے اور ان کے طرز کی قوت پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے ــ اُن کی علمیت بھی اُن کی تحریروں میں ہر جگہ نظر آتی ہے، عربی اور فارسی الفاظ، تراکیب اور اشعار کے استعمال نے اُن کی تحریروں میں شگفتگی پیدا کردی ہے۔ وہ رجب علی بیگ اور محمد حسین آزاد کے روحانی جانشین ہیں۔ غبارِ خاطر ان کے خطوط کا مجموعہ ہے اور اس مجموعہ کی بنا پر انہیں اُردو کے بہترین

خطوط نویسوں میں شامل کیا جاتا ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے اُن کے طرزِ تحریر کے بارے میں کہا ہے ؎

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

الداءٔ والدواء

یہ بار بار کہا گیا ہے کہ عالمِ اسلامی کے گذشتہ آخری مصائب نے مسلمانوں میں تنبہ و اعتبار کے جیسے غیر معمولی علائم و آثار پیدا کر دیے ہیں ان کا پہلے وجود نہ تھا۔ اس قسم کے آزاد قیاسات ہمیشہ ظنون اور مستقبل کے کے نتائج کے محتاج ہوتے ہیں اور ان کی صحت و عدم صحت کے دلائل منٹوں اور لمحوں کے واقعات سے متغیر ہو جاتے ہیں۔

وہ تدبیر دحکیم جو ایک چھوٹے سے بیج کو ایک عظیم الشان تباتاتی ہستی تک پہنچاتا ہے صرف اس کے ہاتھ میں ہے کہ بیداریوں کو استوار، عبرتوں کو نتیجہ خیز اور متحرک نعشوں کو حیّ و قائم اجسام کی صورت بدل دے۔ یہ علائم فطریہ اور آثار طبیعہ جو تم کو دنیا میں اپنے باہر نظر آتے ہیں بعینہ تمہارے اندر موجود ہیں۔ تم جو اس عالمِ صورت و جسم کے ذرے ذرے کی پرستش کرتے ہو بھول گئے، ہو کہ ایک اقلیم قلب و معنی بھی ہے اور اس "عالمِ صغیر" میں جو کچھ ہے اسی عالمِ کبیر کا عکس ہے۔



ابوالکلام آزاد

قلم کا جادوگر

سر روحانیاں داری دلے خود را ندیدمتی

بخواب خود درآ تا قبلہ روحانیاں بینی

آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اپنے سایہ کو اپنے ساتھ متحرک کرتے ہوئے غروب ہوجاتا ہے چاند نکلتا ہے اور عروج و محاق کی منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ موسم بدلتے ہیں اور نئی نئی ہوائیں چلتی ہیں۔ سمندروں میں طوفان اٹھتے ہیں اور آسمان پر بجلیاں چمکتی ہیں جب کہ موسم خشک اور گرم ہوتا ہے تو بارش کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں اور جب علامتوں کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے تو بارش کا نزول ہوتا ہے غرض کہ جو دنیا تمہارے سامنے موجود ہے وہ طلوع و غروب عروج و محاق، تسلط و تنزع، تضارب و تصادم، تجاذل و تسابق، تسفل و ترقی، تبدل و تجدد اور ایاب و ذہاب کا ایک یکسر مرقع ہے جس کے مناظر متلون اور امثال متحرک ہیں۔

بعینہ یہی حال دنیا کا بھی ہے جو تمہارے سامنے نہیں مگر تمہارے اندر موجود ہے۔ وہاں بھی طلوع و غروب ہوتا ہے اور جب کہ تاریکی چھا جاتی ہے تو آفتاب دریچۂ ظلمت سے اپنا سر نکالتا ہے۔ وہاں بھی موسم بدلتے ہیں اور ہوائیں متغیر ہوتی ہیں۔ بہارِ عیش حیات کا پیغام لاتی ہے اور خزاں افسردگی و ہلاکت کے ساتھ ظہور کرتی ہے۔ وہاں بھی سمندروں میں طوفان اُٹھتے ہیں۔ اور زمینوں پر تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ جب موسم بدل جاتا ہے تو یہاں کے آسمان کی طرح وہاں کا آسمان بھی بدل جاتا ہے اور جب پانی برسنے کے لئے آتا ہے تو پہلے نہر کے محیط ٹکڑوں اور سرد ہواؤں کے مرطوب جھونکوں کو

بھیج دیتا ہے۔ قحط اور خشک سالی اس سرزمین کی سب سے بڑی مصیبت سمجھی جاتی ہے لیکن وہاں بھی اس سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں۔ جب آسمان اپنی دریا نوالی کا اور زمین اپنی بخشش کا دروازہ بند کر دیتی ہے تو دریا اتر جاتے ہیں اور سیر حاصل زمین خشک ہو کر چٹیل میدان بن جاتی ہے پھر بربادی اور موت دنیا پر چھا جاتی ہے اور انسان اپنی غذا سے محروم ہو جاتا ہے یہی حال وہاں کا بھی ہے البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں جسم کے لئے موت ہے جس کے بعد بھی زندگی باقی رہتی ہے اور وہاں دل کے لئے ہلاکت ہے جس ہلاکت کے بعد زندگی کا کوئی سامان نہیں۔

جسم و جان، رنگ و بو، لفظ و معنی، صورت و حقیقت یہی دو مختلف دنیائیں اور موجود و مشہود کی دو اقلیمیں ہیں۔ جن کو لسانِ الہی "عالم آفاق و انفس" سے تعبیر کرتا ہے اور یہی وہ عالم معنوی ہے جس کے آثار و علایم اور آیات و اسرار پر قرآن کریم توجہ دلاتا ہے۔

پس گو آثار و علائم ہمیشہ مظنون اور مستقبل کا چہرہ ہمیشہ تاریکی میں ملفوف ہوتا ہے۔ تاہم علامتوں کے ظہور میں شک نہیں۔ عالم اسلامی آج ایک آخری انقلاب کے کنارے پر ہے اور تبدیلیوں کی وہ تمام علامتیں اس کے چپے چپے میں موجود ہیں جو دنیا کے گذشتہ سخت سے سخت انقلاب کی تکمیل سے پہلے ہمیشہ ظاہر ہوا کی ہیں۔ وہ انقلابات عظیمہ جنھوں نے دنیا اور دنیا کے مناظر کو یکسر پلٹ دیا۔ وہ تغیرات مدہشہ جنھوں نے قوموں اور ملکوں کی تاریخ یک قلم الٹ دی۔ وہ جنھوں نے زمین کے جغرافیہ اور اس کی

خشکی اور تری کے حدود میں تبدیلیاں کر دیں۔ وہ جنھوں نے انسانی نسلوں کے عمران و تمدن ان کے عوائد و خصائص کی عمارتوں کو ڈھا کر پھر از سر نو تعمیر کر دیا اور وہ جو اس لیے ظاہر ہوتے ہیں تاکہ حیات و ممات امم کے قانون الٰہی کے مطابق زمین اور زمین کے بسنے والوں کو از سر تا پا بدل دیں ٹھیک ایسے ہی مظاہر و آثار کو اپنے آگے اور پیچھے و یسار رکھتے تھے جیسے کہ آج کی دنیا کے سامنے ظاہر ہو رہی ہیں۔ یہ دنیا میں ہمیشہ ہو چکا ہے اور ایسا ہونا انقلاب امم و ملل کے ایک دائمی قانون کے ماتحت ہے۔

منجملہ علائم و آثار مخصوصہ کے ایک علامت یہ ہے کہ رفتہ پر ماتم اور آیندہ کی حیرت کی جگہ اب بہت سے دماغ ہیں جو کام بھی کرنا چاہتے ہیں اور محض ماتم و فریاد پر قانع نہیں۔

یہ احساس عام ہے اور عالم اسلامی کے دیگر اکناف و اطراف سے قطع نظر خود ہندستان میں بھی باوجود استیلائے یاس و قنوط موجود ہے اور اگر صحیح وسائل اختیار کر لئے تو فی الحقیقت انقلاب حالت کا اسے پہلا بیج سمجھنا چاہئے کل کی فکر آج ہر شخص کے سامنے ہے کل تک مصائب کے درد کا خوف تھا۔ اس لئے صرف ذہن و دماغ ہی ان کو محسوس کر سکتے تھے مگر آج جب وہ ظاہر ہو چکے ہیں اور بقیہ ظہور سامنے ہے تو ان کے سمجھنے کے لئے دماغ کی نہیں بلکہ دیکھنے کے لئے آنکھوں کی ضرورت ہے اور دماغ کم ہوں مگر آنکھوں کی کمی نہیں۔

کچھ تو مایوس ہیں اور کچھ متلاشی مگر جیسا کہ میں مختصراً اشارہ کر چکا ہوں

آج کسی قدر تفصیل کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ سفر کا تہیہ ہی مطلوب نہیں بلکہ صحیح راہ سفر کا معلوم کرنا اور پھر اُس پر چلنا دونوں باتیں شرط کار ہیں۔

آج اس بارے میں بلند ترین حد نظر اور فکر و جستجو کا آخری سدرۃ المنتہیٰ جو لوگوں کے سامنے ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حفظ اسلام و مقامات مقدسۂ اسلامیہ کے نام سے ایک وسیع اور عظیم الشان فنڈ جمع کیا جائے اور ہر مسلمان عہد کرے کہ کعبۂ معظمہ کی حفاظت کو وہ ہمیشہ پیش رکھے گا۔

اس میں شک نہیں کہ زمین کی وراثت اور تاج و تخت کی حکومت میں جو کچھ ہمارے پاس باقی رہا تھا وہ ہماری غفلتوں اور نادانیوں کی نذر ہو گیا اور جو باقی ہے ہر آن اور ہر لمحہ وہ خطرے میں ہے۔ اور اب اگر کوئی متاع آخری رہ گئی ہے تو وہ صرف اسلام کا مبدا اولیٰ اور دعوت الٰہی کا وہ اولین سرچشمہ ہے جہاں "فاران" کی چوٹیاں ہیں جس پر "سعیر" کے بعد خداوند خدائے سینا نے کتاب شریعت اور شمشیر عدل کیساتھ ظہور کیا جہاں وہ محترم و مقدس "غار" ہے جس کی تاریکی میں "داعی الی اللہ و سراج منیر" کی روشنی سب سے پہلے نمودار ہوئی تھی اور جو دعوت اسلامی اور ملت حنیفہ کے اس اولین داعی کی یادگار ہے جس نے اپنے نفس و جان کی قربانیوں کا اسوۂ حسنہ دکھلا کر حقیقت اسلامی کی پہلی بنیاد رکھی تھی۔

پس ضرور ہے کہ ہر مسلم ہستی اس کی خدمت گزاری کی راہ میں اپنے تئیں قربان کر دینے کا حلف اٹھائے۔

یہ سب کچھ سچ ہے اور اس سے کسی طرح انکار نہیں لیکن سوال یہ ہے جو ضرورت ہمارے سامنے ہے اور جس لیلیٰ کے فراق میں مجنوں صفتان عشق کی یہ کچھ بیقراریاں ہیں کیا اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جو سوال ان کاموں کے شروع کرنے کا سبب تھا۔ مشکل یہ ہے کہ اختیار کرنے کے بعد بھی وہی سوال سامنے آجاتا ہے۔

گشت راز دگر آں راز کہ افشا می کرد

مدتوں مجھ کو صرف مشغول آہ و بکار رہنے کا الزام دیا گیا کئی ماہ سے لوگ معترض ہیں کہ صدا اُٹھ رہی ہے مگر مدعا کا پتہ نہیں۔ اس کے اسباب سے تفصیلی بحث کبھی نہ کبھی ہو رہے گی اور غالباً مضمون کے آخر ہیں کردں مگر یہاں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ خاموشی بے وجہ نہ تھی یاران راہ نے منزل مقصود کی جستجو کو جتنا آسان سمجھ رکھا ہے شاید اس قدر آسان نہیں ہے

بیاں کہ مسئلۂ عشق ازاں دقیق تر است

کہ حل شود شرف از فکر باطل ہمہ کس

پھر کہتا ہوں کہ یہ سب شاخیں ضرور ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جڑ کہاں ہے۔ باغ بسانے کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ درختوں کی شاخوں پر پچکاری سے پانی دیجئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جڑ کو تر و تازہ کیجئے آپ کو پتہ معلوم نہیں تو ممکن ہے کہ دوسروں کو معلوم ہو:۔

تو گل از باغ می خواہی من از گل باغ می جویم

من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

یقیناً حالات نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ ضروریات ملی کی غرض سے ایک وسیع "خزینۂ ملی" (نیشنل فنڈ) ضروری ہے۔ لیکن صرف اس سے اُن آنے والے مصائب کو کیوں کر دور کیا جائے گا جو چاروں طرف سے ہم پر امنڈنے والی ہیں۔ کیا ملکوں اور قوموں کا انقلاب ایک ایسا معاملہ ہے جس کو ایک دو کروڑ روپیہ بطور رشوت دے کر ہم اپنے حسب مرضی طے کر لیں گے۔ کیا کرایہ کی فوجیں اور کرایہ کا جوش لندن اور برلن میں ملتا ہے کہ جب کبھی کوئی فوج بلاد اسلامیہ پر حملہ آور ہوگی تو ہم تار کے ذریعہ اجرت طے کر کے فوراً انہیں میدان کی طرف روانہ کر دیں گے۔ کیا ہماری تمام بربادیاں اور نامرادیاں صرف اس لئے ہیں کہ ہم نے اپنے پاس روپیہ جمع نہ رکھا اور کیا یورپ نے صرف افلاس کا الزام رکھ کر ہم سے سلانیک اور ایڈریا نوبل لے لیا۔

ہمارے سامنے آج ہمارا زوال ہے۔ ہم اپنی تجہیز و تکفین کا سامان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے پاس اب اتنی مہلت نہیں بار بار نسخے آزمائیں اور بہت سے طبیبوں سے رجوع کریں۔ ہم کو اس وقت صرف ایک ہی نسخے کی ضرورت ہے اور صرف ایک ہی طبیب کی۔ ہمارے امراض یقیناً بے شمار ہیں۔ اور فرصت ہوتی تو ایک ایک کا علاج کرتے۔ مگر اب تو اسی نسخہ کی تلاش ہی پر انحصار زندگی اور اُمید صحت ہے جو ایک ہو، مگر اپنے اندر ہمارے تمام بے شمار امراض کا علاج رکھتا ہو۔

ابوالکلام

نیاز فتحپوری

نیاز فتح پوری کا پورا نام نیاز محمد خاں ہے۔ ۱۸۸۴ء میں فتح پور (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد امیر خاں تھا۔ نیاز فتحپوری نے عربی اور فارسی زبانوں میں عالمانہ بصیرت پیدا کرنے کے بعد انگریزی کی اچھی تعلیم حاصل کی۔ ویسے وہ ترکی زبان بھی جانتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے بھوپال سے اپنا مشہور رسالہ نگار جاری کیا۔ ۱۹۲۸ء سے لکھنؤ میں رہنے لگے اور نگار آج بھی پابندی کے ساتھ لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔

نیاز بڑی متنوع ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ ادب کی ہر شاخ میں اُن کی ذہانت نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ بلند مرتبہ نقّاد بھی ہیں۔ اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ افسانوی ادب میں ایک انفرادی حیثیت کے مالک ہیں"۔ شہاب کی سرگذشت"، "شاعر کا انجام" "جمالستان" اور "نگارستان" کے افسانوں میں زندگی سے وہ قربت تو نہیں جو اُردو افسانہ کو پریم چند نے عطا کی لیکن نیاز کی یہ ذہنی دنیا بہت حسین ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ خیالی جزیرے نئے تقاضوں کے سیلاب میں ڈوب گئے۔ نیاز فتحپوری مترجم بھی بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے گیتان جلی کا ایسا ترجمہ کیا ہے کہ بقول ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری "دنیا کی کسی زبان میں اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہوسکا۔" ان کے مکتوبات بھی بہت مشہور ہیں اور ان کی شوخی تحریر کا ثبوت ہیں۔

مولوی حکیم............. اور ہم!

وسط ہند اور صوبہ متوسط کا شائد ہی کوئی لکھا پڑھا شخص ایسا ہو جو مولوی حکیم...... صاحب ناظم یتیم خانہ...... شریف سے واقف نہ ہو۔

اپنے اعضا کی مضبوطی، قامت کی تنومندی اور پھیل جانے والے گوشت کے لحاظ سے یہ اس ساخت کے انسانوں میں سے ہیں جن کے جسم کی لمبائی کو ہمیشہ اس کی چوڑائی سے شکایت رہتی ہے۔ ہر چند جسم کی یہ چوکور تعمیر، یہ مربع ترکیب عام طور پر صرف اُن لوگوں میں پائی جاتی ہے جو صرف ایک جگہ بیٹھ کر رات دن بیکاری کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ باوجودیکہ ناظم صاحب رات دن فراہمی چندہ کی فکر میں سرگشتہ و حیران پھرتے رہتے ہیں اور غریب یتیموں کا گہرا درد دل میں رکھتے ہیں، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا، کہ قوم کے محتاج بچوں پر اس رات دن کڑھنے والے انسان کے جسم نے اُس زمانہ میں بھی جب کہ طاعون کے خوف سے شہر کا ہر شخص گھُل کر کانٹا ہو جاتا ہے، ایک اِنچ کی کمی کو منظور کیا ہو۔

ہم نے ناظم صاحب کو متعدد بار موسمی خرابیوں کے زمانہ میں بھی دیکھا، لیکن ان کی یہ خصوصیت کبھی اُن سے منفک نظر نہ آئی کہ :۔

جب وہ کوشش کر کے چلنے میں اپنے آپ کو ذرا تان لیتے تو فربہ جسم کے پٹے باز (کھلونہ) ہو جاتے اور بیٹھتے وقت جب وہ اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتے



نیاز فتحپوری

اُردو ادب میں کئی حیثیتوں کے مالک

تو اُن کی حالت ہو بہو ایسی ہو جاتی جیسے سلولائڈ کا وہ کھلونا جسے آپ کتنا ہی مار مار کر لٹایئے، لیکن وہ بے شرم ہمیشہ بیٹھا ہی رہتا ہے۔

اسی سلسلہ میں غالباً بے محل نہ ہوگا اگر ان کے سراپا کی دو چار خصوصیات اور بھی ظاہر کر دی جائیں۔

رنگ سیاہ، خط و خال بھدے، ناک موٹی، ہونٹ نسبتاً ذرا پتلے، دانت برابر لیکن پان کی سُرخی اُن پر قائم، بھویں چوڑی اور آنکھیں شوخ و شریر، پاجامہ شرعی، جوتہ ہندوستانی، جاڑوں میں سر پر صافہ باندھتے ہیں اور گرمیوں میں کپڑے کی گول ٹوپی جس پر ریشمی یا کلابتونی کام ہوتا ہے۔ ایک رومال میں یتیم خانہ کی روداد، رسید بُک اور اسی طرح کے چند کاغذات لپٹے ہوئے بغل میں۔ یہ ہے ہمارے ناظم صاحب کا سراپا مع اُن تمام اضافیات کے جن سے وہ وہی کام لیتے ہیں جو ایک سپاہی جنگ کے وقت اپنے آلات حرب سے۔

میری اُن کی شناسائی اوّل اوّل اس وقت ہوئی جب وہ ریاست .... میں (جس کو وہ اپنی بہترین چراگاہ سمجھتے ہیں) چندہ کی فراہمی یا ابلہ فریبی کے لئے تشریف فرما ہوئے تھے۔ مجھ میں یہ سخت عیب (یا خوبی) یہ ہے کہ اوّلین نگاہ میں ایک انسان کے تمام نفسیاتی کیفیات اور اخلاقی حالات مجھ پر روشن ہو جاتے ہیں اور بہت کم پہلی دفعہ کی قائم کی ہوئی رائے مجھے بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

صبح کا وقت تھا، سردی ہلکی ہو کر بہت خوشگوار ہو گئی تھی اور میں ایک ایسے دوست کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں میرا جانا صرف تفریح کی بنا پر ہوا

کرتا تھا، لطف و مزاح کی پوری کیفیت مجھ پر طاری تھی کہ بدقسمتی سے جناب ناظم صاحب کا مجسمہ حرکت کرتا ہوا دروازہ کے اندر داخل ہوا اور قبل اس کے کہ میں اُن کے مطالعہ سے فارغ ہوتا ایک ایسی شان کے ساتھ جس میں انسانیت کم اور فضل وکمال کی نمائش سے زیادہ کام لیا گیا تھا، نہایت بلند آہنگی سے ''السّلام علیکم'' کہتے ہوئے قریب آہی گئے چونکہ وہ میرے مکان پر مجھ سے ملنے کے لئے نہ آئے تھے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اٹھ کر خیر مقدم ادا کرتا لیکن میرے دوست نے جو حقیقت سے بہت زیادہ اپنے اخلاق کی نمائش میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں، سرو قد تعظیم دی، ہاتھ ملایا۔ قریب کی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی اور اپنا مسکراتا ہوا لیکن خاموش چہرہ ان کی طرف بڑھا دیا، گویا وہ یہ سوال کر رہے تھے کہ ''جناب نے کیوں زحمت فرمائی''۔

ناظم صاحب ایسے پیشہ ور چندہ وصول کرنے والے کو جس انداز سے اپنا تعارف کرانا چاہیے تھا، اس میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ تھی، یتیم خانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا بیان وہاں کا حُسنِ اہتمام، قرآن و احادیث کے حوالہ سے یتامیٰ کی خدمت کا اجر، اور پھر اپنے خدمات جلیلہ اور ایثار و قربانی کا بیان، نقشوں اور کاغذات کے ذریعے سے آمد و خرچ کا حساب، یتیم خانہ کی کامیابی کی روداد، بڑے بڑے لوگوں کی امداد کا ذکر، الغرض انہوں نے ایک نہایت ہی مربوط و مسلسل بیان کے ذریعہ سے (جو برسوں کی مشق کی وجہ سے بہت صفائی کے ساتھ ادا ہوتا تھا) میرے دوست کو متاثر کرنے کی پوری کوشش کی اور آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ ہیں یہاں صرف آپ ہی کی ہمدردی، اخوت، اور

اسلام دوستی پر اعتماد کرکے آیا ہوں جس کے اعتراف میں سوائے اس کے میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ"

ان کی فطرت کے مطالعہ کرنے میں جو کمی رہ گئی تھی وہ اس تقریر کے دوران میں پوری ہو گئی اور جب وہ اس طرف سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوئے تو میں اُن کے حملہ کی مدافعت کے لئے پوری طور پر آمادہ و تیار تھا۔

انہوں نے رسید کی کتاب نکال کر میری طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا کہ :-

"جناب کی طرف سے کس قدر عطیہ تحریر کر دوں"

میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "دو ہزار"

انہوں نے خفیف تبسم کے ساتھ پہلے میرے دوست کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولے :-

"تو پھر آپ اپنے ہی قلم سے لکھ دیجئے"

میں نے کہا "لائیے"

اور میز سے قلم اٹھا کر میں نے رسید بک کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ غالباً اس سے زیادہ اپنی ایکٹنگ کو قائم نہ رکھ سکتے تھے اور ایسا شخص جب ایکٹنگ سے جدا ہو کر کسی حملہ کی مدافعت کرتا ہے تو ہمیشہ برہمی کے ساتھ اس لئے انہوں نے رسید بک کو پھر اپنی جیب میں رکھ لیا اور بولے :-

"اگر آپ کو امداد کی توفیق نہیں ہے تو مذاق بھی نہ کیجئے"

میں نے نہایت نرمی کے ساتھ جواب دیا کہ :-

مذاق کا موقع ابھی تو پیدا ہی نہیں ہوا، آپ نے خود ہی میری طرف سے عطیہ تحریر کرنا چاہا اور جب میں نے اس کی مقدار دو ہزار متعین کی تو آپ ہی

نے اس سے احتراز کیا۔ اگر میں اس کو منظور نہ کرتا کہ میری جانب سے اس قدر عطیہ تحریر کیا جائے تو بے شک مذاق تھا، جناب ناظم صاحب میں آپ کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے نام کے ساتھ اس قدر عطیہ کی نسبت نہایت خوشی سے گوارا کرلوں گا اور کبھی کسی سے ذکر نہ کروں گا کہ اس سے مقصود صرف فہرست میں ایک فرضی اضافہ کرنا تھا۔

میں ان کا چہرہ دیکھ کر پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ مغلوب الغضب آدمی ہیں، لیکن اب عملی ثبوت بھی مل گیا، اُن کے سیاہ رنگ میں چہرہ کی سُرخی تو زیادہ نمایاں نہ ہوسکی، لیکن ان کی آنکھوں کا مکر ظاہر ہو گیا اور ایک ایسے غصہ کے ساتھ جس میں انسان اپنے خبث باطن کو نہیں چھپا سکتا اور جس کا ظہور اکثر و بیشتر اس نوع کے وعظ پیشہ اور مولوی منش لوگوں کی طرف سے ہوا کرتا ہے، کف آلود لبوں کے ساتھ تن کر بولے:۔

"اسلام کو تمھیں ایسے لوگوں نے تباہ کیا ہے اور تمھیں ایسوں کے لئے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ازلی اندھے، گونگے اور بہرے ہیں۔ تمھارے دل سیاہ ہیں، پتھر سے زیادہ سخت ہیں اور تم کبھی کسی سے اچھے کام کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتے! لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ میں تو صورت دیکھ کر سمجھا تھا آپ کوئی بھلے آدمی ہوں گے، لیکن یہ کیا خبر تھی کہ آپ کے اندر ابلیس حلول کر گیا ہے۔"

جب مجھے کسی ایسے آدمی سے گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے تو میں پورا لطف اٹھانے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں اور ہلکی سی ہلکی کیفیت بھی برہمی کی اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیتا، میں نے نہایت نرمی کے ساتھ

جواب دیا کہ:۔

"مولانا آپ بزرگ ہیں ہمارے مرشد و رہنما ہیں جو چاہئے ارشاد فرمایئے اور جس قدر جی میں آئے برا کہہ لیجئے۔ مجھے کبھی ناگوار نہ ہوگا، لیکن تھوڑا سا افسوس صرف یہ کہ میں آپ کی گالیوں کو سُن کر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ع

جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکرخارا"

اور ہاں قبلہ یہ تو فرمایئے کہ ابلیس کیسے حلول کرتا ہے۔ ایک زمانہ کے بعد ملاقات ہوئی ہے، آج تو بغیر دریافت کئے میں آپ کو جانے نہ دوں گا۔"

ناظم صاحب قبلہ پھر بولے کہ:۔

بس خاموش رہئے، میں مسخروں سے بات نہیں کرتا۔"

اور میرے دوست سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"میرے لئے کیا حکم ہوتا ہے؟"

اُنھوں نے کہا کہ "میں ہر وقت آپ کی امداد اور ایسی قومی تحریکوں کی خدمت کے لئے تیار رہوں، لیکن آپ کا بڑا احسان میرے اوپر ہوگا اگر آپ (میری طرف اشارہ کر کے) اس دہریہ کو کسی طرح قابو میں لائیں۔ (میری طرف مخاطب ہو کر) کیوں جی تمھیں مطلق کوئی ہمدردی قوم کے یتیم بچوں سے نہیں ہے اور ناظم صاحب کی گفتگو سے تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "اثر کی آپ نے خوب کہی، میں روز شام کو بازار میں سانڈے کا تیل بیچنے والوں کی آوازیں سُنا کرتا ہوں اور خاموش گزر جاتا ہوں۔"

یہ سُننا تھا کہ ناظم صاحب پھر بے قابو ہو گئے۔

الغرض یہ تھی میری ان کی اوّلین تقریب ملاقات جو خدا جانے کس ساعت میں ہوئی تھی کہ اس کے بعد بھی جب مجھ سے وہ ملے ہمیشہ نوک جھونک ہی رہی، اور کبھی میں نے ان کو سنجیدگی کے ساتھ خطاب کرنے کا اہل نہ سمجھا۔ ان کو ازدواجوں کے ساتھ طبابت میں بھی کمال رکھنے کا دعویٰ تھا۔ لیکن مجھ پر اس کی بھی حقیقت جلد روشن ہو گئی، ان کا معمول تھا کہ جب کسی شخص سے ملتے تو سب سے پہلے متعلقین کی خیریت دریافت کرتے اور چونکہ بڑے خاندانوں میں کوئی نہ کوئی ہمیشہ علیل ہی رہتا ہے اس لئے جواب ان کی توقع کے موافق ملتا اور مرض دریافت کرنے کے بعد کبھی تو وہ فوراً کہہ اُٹھتے کہ اس کا علاج تو میں شرطیہ کرتا ہوں اور چند واقعات اپنی حذاقت کے بتا کر فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے اور کبھی مریض کی نبض دیکھ کر (اگر زیادہ متاثر کرنا مقصود ہوتا) حکم لگا دیتے کہ "مرض نہایت سخت ہے اور اگر احتیاط نہ کی گئی تو صحت حاصل ہونا محال ہے"۔ چونکہ ہندوستان کے مریضوں میں ۹۰ فی صدی سے زیادہ ایسے ہوتے ہیں جو فن طب سے نابلد ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا یہ حربہ بہت جلد کارگر ہو جاتا اور وہ پھر چندہ کے ساتھ دواؤں کے لئے بھی کافی رقم وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ایک دن شام کو میرے مکان پر تشریف لائے، میں کچھ مضمحل سا تھا، صورت دیکھ کر بولے:۔

"آپ کے چہرے پر خون بالکل نظر نہیں آتا، مجھے اندیشہ ہے، کہیں تولیدِ خون تو آپ کی بند نہیں ہو گئی، لائیے ذرا نبض تو دیکھوں"!

میں نے کہا کہ "آپ کا خیال غلط ہے، مجھے تو خون کی زیادتی کی شکایت تھی چنانچہ آج ہی فی صد کے ذریعے سے چار سیر خون میں نے نکلوایا ہے، اسی لئے شاید آپ کو چہرہ پھیکا معلوم ہوتا ہوگا، لیکن کل تک یہ حالت باقی نہ رہے گی، آپ بالکل مطمئن رہیں۔"

وہ یہ سُن کر مسکرائے اور بولے کہ "گھر میں تو سب خیریت ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ "آج کل فصل خراب ہے، اور اس لئے قریب قریب سب بیمار تھے لیکن ابھی ابھی میں نے دس تولہ سنکھیا پیس کر کھلا دی ہے، صبح تک انشاء اللہ سب تندرست ہو جائیں گے۔"

الغرض انہوں نے بہت کوشش کی کہ کسی نہ کسی کی بیماری کی خبر انہیں مل جائے اور وہ اپنی خدمات پیش کر کے مجھے رام کر سکیں لیکن انہیں اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ جب چلنے لگے تو فرمایا کہ:-

آپ نے اپنا چندہ ابھی تک نہیں دیا، میں کل جا رہا ہوں، مجھے بہت افسوس ہوگا اگر آپ کا نام یتیم خانہ کی فہرست معاونین میں شامل نہ ہوا"

میں نے جواب دیا کہ "میری بد قسمتی، لیکن کیا کروں یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میرے اوپر...... یتیموں کی خدمت کیوں کر فرض ہے جبکہ خود میرے گھر کے بہت سے افراد میری اعانت کے محتاج ہیں علاوہ اس کے مجھے یہ بھی یقین نہیں آتا کہ جو چندہ آپ وصول کرتے ہیں وہ حقیقتاً یتیموں کے کام آتا بھی ہے یا نہیں۔ آپ صرف روئداد، اور انجمن کی کارروائی دکھا کر اپنی خلوص نیت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ان میں سے کوئی چیز الہامی

نہیں ہے اور روپیہ وصول کرنے کے لئے اس سے بھی زیادہ غیر معصوم لٹریچر دنیا میں تیار ہوتا رہتا ہے۔ بہرحال میں اس قسم کی امداد بالکل ناجائز سمجھتا ہوں۔ البتہ مقامی لوگ اگر کسی ایسی تحریک سے مطمئن ہوں تو وہ مدد کر سکتے ہیں اور انہیں کرنی چاہیے"

ناظم صاحب نے بہت کچھ سر مارا، لیکن اس باب میں چونکہ میں اکبر الہ آبادی کا معتقد ہوں۔ اس لئے انہیں کامیابی نہ ہوئی جب وہ میری طرف سے مایوس ہوگئے۔ تو پھر انہوں نے اسی کو غنیمت جانا کہ جب وہ کسی جلسہ میں لوگوں کو اپنے مکر کا شکار بنا رہے ہوں تو کم از کم میں وہاں نہ ہوں، لیکن یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جب اور جہاں کہیں وہ پہنچے میں بھی ضرور پہنچ گیا اور نتیجہ یہی ہوا کہ ان کی تمام کارگاہ فریب درہم برہم ہوگئی، ایک روز ریاست کے ایک نہایت ہر دل عزیز اور مشہور افسر کے مکان پر مجمع احباب تھا اور ناظم صاحب تقریر فرما رہے تھے کہ:۔

"گزشتہ سال جب ..... شریف میں طاعون ہوا تو چین کے ایک بزرگ جن کی عمر ایک سو پچاس کی تھی زیارت مزار کے لئے تشریف لائے اور قریب کے پہاڑ پر قیام کیا، جب وبا بہت زیادہ پھیلی اور لوگوں کی پریشانیاں حد سے گزر گئیں تو وہ بزرگ پہاڑ سے اتر کر یتیم خانہ میں آئے اور ایک تعویذ مجھے دیا کہ اس کو چھپوا کر تقسیم کر دو لیکن سوا لاکھ سے زیادہ تقسیم نہ کرنا اور ایک آنہ سے زیادہ نذرانہ نہ لینا چنانچہ اس وقت تک تمام تعویذ ختم ہوگئے اور صرف چار ہزار باقی ہیں جو میں یہاں لیتا آیا ہوں، یہ تعویذ اس قدر مجرب ثابت ہوا کہ طاعون میں مبتلا ہونے کے بعد بھی اگر یہ کسی کے گلے باندھ دیا گیا تو فوراً اچھا ہو گیا اور ایسی تو ایک مثال بھی نہیں

ہے کہ پہلے سے کسی نے باندھ لیا ہو اور پھر وہ مبتلا ہو گیا ہو۔"

چونکہ اس زمانہ میں یہاں بھی یہ مرض پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے قدرتاً ہر شخص کو اس طرف توجہ ہوئی اور نذرانہ دے کر دو چار تعویذ ہر شخص نے لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ان کی طبابت کا سب سے زیادہ دردناک واقعہ جو میرے علم میں آیا یہ تھا کہ ایک نہایت ہی نیک نفس شخص جو ریاست کے ایک ذمہ دار افسر تھے حکیم صاحب کے فریب میں آ گئے اور دواؤں کا استعمال شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ان کا دماغ خراب ہوا اور پھر تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ ان کی موت کے بعد ان کے بیوی بچوں کی جو حالت ہوئی اور جس سختی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں وہ ناقابل بیان ہے۔

ناظم صاحب ہفتوں ان کے پاس رہتے اور دوائیں بنانے کے بہانہ سے خوب انہیں لوٹتے اور آخر کار یہ غارت گری اس حد تک بڑھی کہ ان کی جان بھی اس کے نذر ہو گئی۔

ناظم صاحب کے چلے جانے کے بعد باوجود اس کے کہ میں نے بہت کچھ حقیقت کا انکشاف کر دیا تھا۔ بعض لوگ ایسے تھے جو اب بھی اُن کی خلوص و صداقت کے قائل تھے۔ لیکن جب میں نے انہیں یتیم خانہ کے صدر اعظم کی ایک تحریر ناظم صاحب کے نام دکھائی (جو اُن کی روانگی کے بعد موصول ہوئی تھی اور پوسٹ مین غلطی سے مجھے دے گیا تھا) تو یہ پردہ اور زیادہ اٹھا۔ اس تحریر میں درج تھا کہ:-

"آپ نے جو رقم وہاں جمع کی ہو اُسے فوراً اپنا حق ۳۰ فی صدی وضع کر کے بھیج دیجئے"

ناظم صاحب نے یتیم خانہ کی رقم جمع کی یا نہیں؟ اس کا حال تو پوری طرح معلوم نہیں، لیکن یہ بات ضرور سب کے علم میں ہے کہ اس کے چند دن بعد ہی ان پر خیانت کا مقدمہ چلا۔

ایک سال کے بعد پھر وہ رونما ہوئے تھے، لیکن اس مرتبہ ان کا مرتبہ زیادہ بلند تھا کیونکہ بجائے ملازمت کے انہوں نے خود اپنا یتیم خانہ قائم کر لیا تھا اور اس کے مہتمم اعلیٰ اور مالک و مختار کی حیثیت سے دورہ فرما رہے تھے۔ مدعا یہ ہے کہ پہلے تو انہیں سو روپیہ میں تیس روپیہ ملتے تھے، لیکن اب وہ سب کے مالک تھے اور نہایت اطمینان سے لوگوں کو لوٹ رہے تھے، کیونکہ اب یہ بھی خوف نہ باقی رہا تھا کہ اُن سے حساب کا مطالبہ کیا جائے گا۔

نیاز فتحپوری

رشید احمد صدیقی

صدیقی صاحب کی ولادت جونپور میں ہوئی۔ انٹرنس تک وہیں تعلیم پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج چلے آئے اور فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے اُن کے قلم نے علی گڑھ میگزین کے صفحات پر گُل کھلانے شروع کر دیے تھے۔ ان کا فطری ذوق وہاں اتنا سازگار ثابت ہوا کہ ۱۹۲۱ء میں اپنے ہی کالج میں اُردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ رفتہ رفتہ جب یونیورسٹی بنی اُردو کا باقاعدہ شعبہ قائم ہوا تو یہ اس کے صدر بنا دیے گئے۔ "مضامین رشید" خنداں، اور "گنج ہائے گراں مایہ" بار بار پڑھے جانے کے قابل ہیں رشید صاحب طنز نویس اور مزاح نگار ہیں۔ طنز و مزاح کے لئے فکرِ کامل۔ قوتِ مشاہدہ، لطافتِ طبع۔ وسیع مطالعہ۔ سنجیدہ دماغی اور مہذب ماہر قلم کی ضرورت ہے۔ اپنے ارد گرد کی اشیاء اور افراد کی ایک ایک ادا کا نقطہ نقطہ نظروں میں سمایا ہوا ہو تو اس صنف میں کمال دکھایا جا سکتا ہے۔

رشید صاحب میں یہ صفات حیرت انگیز طور پر جمع ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ سوسائٹی کی دُکھتی رگ کی طرف انگلی بڑھاتے ہیں تو اس رگ کے ساتھ دیکھنے والے بھی پھڑک جاتے ہیں

اسی طرح جب کسی تمدنی کمزوری پر چوٹ کرتے ہیں تو وہ بہت پُراثر ثابت ہوتی ہے۔

رشید صاحب کے نتائجِ افکار سننے اور سر دُھننے ہی کے لئے نہیں ہیں بلکہ عقل کی آنکھیں کھول دینے کے لئے بھی ہیں۔

ان کا طرزِ تحریر نرالا ہے۔ باتیں تو جانی بوجھی ہوتی ہیں لیکن جن لفظوں اور فقروں میں وہ ادا کرتے ہیں وہ فقرے اور لفظ نئے نئے معنوں کے حامل ہوتے ہیں۔

رشید صاحب کی "طنزیات و مضحکات" اردو میں ایک عالمانہ تالیف ہے۔ آئندہ کے مزاح نگار اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

کونسل۔ کانفرنس۔ کمیٹیاں

میرے ایک بڑے محترم لیکن ویسے بزرگ تھے جن کی عادت تھی کہ وہ جب تک دن میں بے شمار جھوٹ نہیں بول لیتے تھے یا اتنی ہی مرتبہ میٹنگ نہیں کر لیتے تھے اس وقت تک نہ خود چین سے بیٹھتے تھے اور نہ دوسروں کو چین سے بیٹھنے دیتے تھے۔ جھوٹ بولنا چاہتے تھے تو میٹنگ کرتے تھے اور میٹنگ کرنا چاہتے تھے تو جھوٹ بولتے تھے۔ کمیٹیاں بنانے اور بات بگاڑنے کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا۔ پینا۔ بات چیت ہار جیت۔ مارپیٹ ہیرپھیر۔ شادی غمی۔ دھوکا دھڑی۔ سب کچھ میٹنگ کے



رشید احمد صدیقی

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبہ آردو کے صدر ہیں۔
آردو انشاپردازی میں خاص طرز کے مالک اور لطیف مزاحیہ
نگاروں میں ممتاز ہیں۔

ذریعہ عمل میں آتا۔ عقل و ایمان سے زیادہ میٹنگ پر بھروسہ کرتے۔ سوچتے کچھ تھے، لکھتے کچھ تھے۔ پڑھتے کچھ تھے فیصلہ کچھ ہوتا۔ کرتے کچھ تھے۔ اکبر مرحوم آپ کو یاد ہوں گے، اور غالباً ان کا یہ شعر بھی ؎

کمیٹی میں چندہ دیا کیجئے ترقی کے ہجے کیا کیجئے

اکبر کا نسبتاً فارغ البالی کا زمانہ تھا ہمارے ان بزرگ نے وہ زمانہ پایا تھا جب روپیہ پیسہ کے اعتبار سے تحت اللفظ ہو چکے تھے اس لئے موصوف نے اس شعر میں ترمیم کی تھی ؎

کمیٹی میں پنچے دیا کیجئے ترقی کے ہجے کیا کیجئے

جہاں تک میرا تجربہ ہے اور شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ جب کسی کام کو ٹالنا یا نہ کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہ کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے اس کے ساتھ جب یہ منظور ہوتا ہے کہ اس کام کو اس قابل نہ رکھا جائے کہ کوئی دوسرا اسے پورا کر سکے تو اس کی مٹی کسی کانفرنس میں پلید کرائی جاتی ہے کمیٹی۔ کونسل کمیشن جوبلی ڈے وغیرہ ایک ہی مرض کی مختلف دلچسپ علامتیں ہیں۔ پرانے زمانہ میں جب ریڈیو کا دور دورہ نہ تھا اس وقت امراض دور کرنے۔ مقدمہ جیتنے روزی کمانے اولاد پیدا کرنے، مینہ برسانے، محبوب کو قابو میں لانے اور رقیب کو واصل جہنم کرنے کے لئے۔ ٹونے۔ ٹوٹکے سے کام لیا جاتا تھا۔ اب اس قسم کے کاموں کے لئے کونسل اور کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ عدالتیں کھولدی گئی ہیں رزدلوشن پاس کئے جاتے ہیں، جیل خانے کے دروازے کھٹکھٹائے جاتے ہیں، شریفوں کی پگڑیاں اُچھالی جاتی ہیں اور ریڈیو پر تقریر کی جاتی ہے،

آپ نہیں تو آپ کے بزرگوں نے (اور اس سے نہ آپ کی تحسین مقصود ہے اور نہ آپ کے بزرگوں کی توہین) وہ زمانہ یقیناً دیکھا ہوگا جب بارش نہ ہونے پر دیہات کے لڑکے ننگ دھڑنگ محض ایک لنگوٹی زیب ستر کئے دروازے دروازے اُچکتے کودتے شور مچاتے کیچڑ پانی میں لوٹتے چیختے چلاتے تھے۔ ''کال کلوٹی اُجڑ دھوتی، کالے میگھا پانی دے'' وہ باتیں اب خواب وخیال ہو چکی ہیں، ان کی جگہ اب جلسوں جلوسوں زندہ باد کے نعروں اور بہت سی باتوں نے لے لی ہے۔ جن کا تذکرہ یوں نہیں کرتا کہ ع

دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم

عام طور پر کسی ملک یا قوم یا ادارے کی ترقی کا اندازہ اس کی کمیٹیوں کونسل اور کانفرنس سے کرتے ہیں۔ لوگ اُن کے مہمل ہونے کے قائل بھی ہیں لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ کمیٹی اور کانفرنس کی ممبری قوم اور ملک کے لئے مفید ہو یا نہ ہو خود ممبروں کے لئے نہایت نفع بخش ہوتی ہے آپ کے کسی کمیٹی کے ممبر ہو جانے کی دیر ہے آپ کے لڑکے بغیر کسی فیس کے تعلیم حاصل کریں گے۔ ہسپتال والے آپ کا مفت علاج کریں گے۔ سفر بلا ٹکٹ کر سکیں گے، نان۔ نفقہ۔ بھنگی۔ بہشتی۔ نائی۔ دھوبی۔ درزی۔ موچی۔ گرہ کٹ کوکین فروش۔ کن سیلئے، گورکن۔ کفن چور، پٹواری۔ اڈیٹر۔ مسخرے سب کی مفت خدمات آپ کے لئے وقف ہوں گی آپ کو سوا اپنی تجہیز و تکفین کے اخراجات کے کسی اور مد میں مالی زیر باری نہ ہوگی بشرطیکہ مردِ آخر بین کی حیثیت سے آپ نے اس کا انتظام بھی اپنی زندگی ہی میں نہ کر لیا ہو۔

چنانچہ یہ امر مسلم ہے کہ جو حرکتیں کسی فرد کے لئے جیل خانے جانے کا موجب بن سکتی ہیں وہی باتیں کمیٹی یا کونسل کے ممبروں کے لئے ہر دلعزیز اور ذی اثر ہونے کا ثبوت بہم پہونچاتی ہیں۔ کمیٹی کانفرنس اور اس قسم کے دوسرے اداروں کو جمہوری نظام کی پیداوار سمجھا جاتا ہے لیکن جمہوری نظام اس وقت تک جمہوری نظام کیوں کر کہا جاسکتا ہے جب تک اس قوم کی روایات یا میلانات جمہوری نہ ہوں جس نے اس نظام کو اختیار کیا ہو ہمارے ملک میں کمیٹیوں یا کونسلوں کی کمی نہیں ہے اور ضابطے کی رو سے آپ ان پر اعتراض بھی نہیں کرسکتے لیکن یہ کمیٹیاں اور کونسلیں کن افراد پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان کی اُفتادِ ذہنی کیا ہوتی ہے یہ بھی اپنی جگہ پر جانی بوجھی ہوئی چیزیں ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ باتیں ہوتی ہیں جو جمہوری نظام کی آڑ میں شخصی جبروت یا جماعتی تنگ نظری کی ترجمان ہوں لیکن اس قسم کی باتیں ہم آپ برابر دیکھتے سنتے آئے ہیں اور ریڈیو پر وہی باتیں دہرائی جاتی ہیں جو اخبارات میں لکھی ہوں لیڈروں کا تکیہ کلام ہوں یا یکہ والوں کی زبان پر ہوں ریڈیو پر تقریر کرنے والوں کی بدنیتی اور بدمذاقی کا ثبوت ہے۔ اسی کو بدمعاملگی بھی کہتے ہیں۔ میں بدمعاملگی کے بجائے نمک حرامی کا لفظ استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن اس خیال سے رُک گیا کہ نمک حرامی کی فہرست یوں ہی کیا کم طویل ہے کہ اس کو براڈکاسٹ بھی کیا جائے۔ بہرحال اس قسم کی باتیں ریڈیو پر تقریر کرنے والوں سے سرزد ہوتی ہوں یا نہیں، ریڈیو سٹ کا لائسنس نہ رکھنے والوں سے غالباً ضرور سرزد ہوتی ہوں گی غالباً کا لفظ میں نے احتیاطاً استعمال کیا ہے اس سے آپ میرے خوف کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور میری احتیاط کا بھی میری

طرح آپ بھی عدالتوں یا بڑے آدمیوں سے ڈرتے ہوں تو غالباً وغیرہ۔ ممکن اور اسی طرح کے بعض دوسرے احتیاطی الفاظ اور فقروں کا ورد رکھا کیجئے بعض الفاظ میں بھک سے اڑ جانے والے مادے کی خاصیت ہوتی ہے۔ ان کے لئے یہ الفاظ پانی کے چھینٹے کا کام دیتے ہیں۔ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ جس بات کو عام طور پر نہیں کرنا مقصود ہوتا ہے اُسے کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجئے وہ کام بہ تیقن ہو جائے گا۔ کوئی بات یقینی ہو لیکن آپ اُسے مشتبہ بنانا چاہتے ہوں تو کمیٹی یہ کام بھی انجام دے گی۔ آپ کسی شخص کو مجرم قرار دینا چاہتے ہوں اور کوئی سبیل اُس کے مجرم قرار دینے کی نظر نہ آتی ہو تو یہ فرض کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجئے۔ کمیٹی اس کے اسلاف اور اولاد تک کو مجرم ثابت کر دے گی۔ کمیٹی اور کونسل صلح کے زمانے میں وہی کرتی ہیں جو اسلحہ اور بارود جنگ کے زمانہ میں کرتے ہیں۔ عدالتوں میں جو چیز فردِ جرم کہلاتی ہے وہی کمیٹی یا کانفرنس میں ٹرم آف ریفرنس ہوتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ عدالت میں صفائی دینے سے آپ کے بے گناہ ثابت ہونے کا امکان ہے اور آپ بری بھی کئے جا سکتے ہیں کمیشن کی زد میں آپ کا جاں بحق ہو جانا مسلم ہے۔ مثلاً کمیٹی، کونسل یا میٹنگ کی کارستانیاں ملاحظہ فرمائیے۔ فرض کیجئے مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ ہندوستان کا چقندر خطرے میں ہے سب سے پہلے یہ خبر اخبار میں شائع کی جائے گی نہایت جلی اور شعلہ ناک سرخیوں کے ساتھ۔ دوسرے دن تار آنے شروع ہو جائیں گے کہ مسئلہ چقندر پر غور کرنے کے لئے فلاں فلاں مقامات پر جلسے ہوئے جس میں "چقندر زندہ باد" کے نعرے لگائے گئے اور باتفاق رائے یہ تجویز پاس

کی گئی کہ ہندوستانی چقندر کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی جارہی ہے اور اس کے مقابلے میں غیر ملکی چقندر کو رعائتیں حاصل اور جو سہولتیں فراہم کی جارہی ہیں اس سے تمام ملک کے چقندر بیزار ہیں اگر حکومت نے چقندر کے تحفظ میں مناسب کارروائی اختیار نہیں کی تو سارے ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔ چنانچہ تجویز پاس کی گئی کہ تمام ملک میں "یوم چقندر" منایا جائے "چقندر" کا جلوس نکالا جائے لوگوں کو چاہئے کہ اس دن وہ صرف چقندر کھائیں جن کو میسر نہ آئے وہ چقندر کی صورت بنائیں عورتیں بطور فیشن اور بچے بطور کھلونا استعمال کریں۔ چقندر ریلیف فنڈ کھولا جائے لیڈروں کو اس کے ہار پہنائے جائیں اطبا نسخوں میں لکھیں شعرا بطور قافیہ استعمال کریں گوئیے اس پر تان توڑیں روشن خیال بطور آرٹ، طلبا بطور اسٹرائک، دنگا، بشکل نظائر۔ پولیس بطور چقندر چارج، مصنّفین بطور اردو ہندی یا ہندوستانی استعمال کریں اور ہر شخص اس بات کا عہد کرے کہ جب تک وہ چقندر کو آزاد نہ کرائے گا کوئی کام ایسا نہ کرے گا جو روایاتِ چقندری کے خلاف ہو۔ اس کے بعد ہی کونسل میں یہ سوال پیش ہوگا کہ کیا حکومت اس عام بے چینی اور ہلچل سے واقف ہے جو چقندر کی حمایت میں راس کماری سے کشمیر اور سندھ سے آسام تک پھیل چکی ہے؟ جواب اثبات میں ہو یا نفی میں، قوم کو اپنے جذباتِ چقندری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کونسل کا اجلاس ملتوی کیا جائے اب جن بزرگوں کے پورٹ فولیو میں چقندر ہوگا وہ فرمائیں گے حکومت اس مسئلے پر غور کر رہی ہے کہ کچھ سرکاری کچھ غیر سرکاری اراکین کا ایک چقندر

کمیشن مقرر کر دیا جائے جو پوری تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ اس کونسل میں پیش کرے۔ چقندر کمیشن کے اراکین کی نامزدگی کا مسئلہ بعض نوعیتوں سے بڑا دلچسپ ہے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون کون سے ممبر ایسے ہیں جنہیں کسی اور سبب گوبھی۔ گاجر۔ کمیٹی یا کمیشن میں جگہ نہیں ملی ہے۔ ان کے کھپانے کا یہ بہترین موقع ہے کونسل میں اس قسم کے داغ تنجن یا دال دلیا کا انتظام نہ ہو تو قسم قسم کے ممبروں سے عہدہ برآ ہونا حکومت کے لئے مشکل ہو جائے اب کمیشن کے اراکین ان مقامات کا دورہ کریں گے جہاں چقندر کا کاروبار ہوتا ہے چقندر کے اعداد فراہم کئے جائیں گے، چقندر خوروں کا حُلیہ، چقندر خوروں کی عمر، تعداد نمائندگی، تعلیم، آمدنی و خرچ، حرکات و سکنات، توالد و تناسل کا جائزہ لیا جائے گا۔ غیر ملکی ماہرینِ چقندر کی خدمات حاصل کی جائیں گی ہر ممبر اپنے اپنے سفر خرچ کا حساب لگائے گا اور بالآخر اس چقندر گردی کو گرمی کے زمانے میں کسی پہاڑ پر ختم کر دیا جائیگا جہاں اس کی رپورٹ تیار کی جائے گی۔ اس رپورٹ کے شائع ہوتے ہی تمام ملک میں نئے سرے سے انتشار و ہیجان برپا ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک گول میز کانفرنس قائم ہوگی اس میں شریک کئے جانے کے لئے لوگ دوڑ دھوپ شروع کر دیں گے۔ کچھ لوگ چقندر کی حمایت میں بھلے مانسوں کی عزت و عافیت کے درپے ہوں گے، کچھ عوام کو ایمان و دھرم کا واسطہ دلا کر اپنا جلوس نکلوائیں گے، کچھ مسجد کے سامنے باجہ بجائیں گے کچھ ارتھی پر ڈھیلے پھینکیں گے، کچھ خطبۂ صدارت تصنیف فرمائیں گے، کچھ فاقہ کریں گے کچھ تار

بھیجیں گے، کچھ انٹرویو دیں گے بقیہ ہلڑ مچائیں گے، اسٹرائک کریں گے، جیل خانے جائیں گے ایک آدھ مر بھی جائے گا۔ انجام یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض گول میز کانفرنس کے ممبر بنائے جائیں گے اور بقیہ سنکھیا کھانے یا سرکاری گواہ بننے کی فکر کریں گے دنیا میں جب تعلیم اور بے روزگاری عام ہوتی ہے تو آمدنی کے عجیب و غریب ذرائع بھی نکل آتے ہیں بے روزگاری سے میری مراد معاش میسر آنا ہی نہیں بلکہ اکثر معقول مشغلے کا میسر نہ آنا بھی ہے۔ کسی زمانہ میں ہمارے ہاں کھانے پینے کی کمی نہ تھی تو لوگ پتنگ اڑاتے تھے بٹیر لڑاتے تھے اور دوائیں کھاتے تھے۔ اب افواہیں اڑاتے ہیں دعوتیں کھاتے ہیں، پہلے معیشت تھی مشغلے نہ تھے اب مشغلے ہیں معیشت نہیں ہے۔ پہلے رؤسا تھے جن کے مصاحب ہوتے تھے ارباب نشاط تھے اور پکے گانے تھے۔ اب لیڈر ہیں جن کے مصاحب اور ارباب نشاط بھی ہیں "توضیح سے ڈرتا اور آپ سے معافی مانگتا ہوں" پکے گانے کے بجائے قومی نعرے اور خطبۂ صدارت ہیں جن میں کہیں غزل کا لوچ، قصیدے کا زور، رجز کا آہنگ، مثنوی کی روانی اور مرثیہ کا سوز و گداز ہے تو کہیں تعصب کی بساند، مشیخت کی بکواس اور حسد کی سڑانڈ ہے پہلے جو کچھ دربار اور حرم سراؤں میں ہوتا تھا اب کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں ہوتا ہے۔ پہلے جو نصیب دشمناں تھا اب سرِ دستان ہے۔ کمیٹیاں اور کانفرنس بجائے خود معقول چیزیں ہیں جب نامعقول وسیلے بن جاتی ہیں تو شرفا کو پگڑی سنبھالنے اور بھیک مانگنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ جمہوری نظام، جس کے یہ کمیٹی کونسل کھلونے ہیں، اس کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ان میں نامعقول

بات کو بھی فروغ دینے کا امکان بڑھ جاتا ہے لیکن یہاں میں جمہوری اور غیر جمہوری نظام کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس قسم کی بحثیں یا تو اسکول کالج کے طلبا کرتے ہیں، مثلاً فلاں شخص نے یہ کہا ہے فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں وغیرہ آپ مانتے ہیں تو آپ کی خوش نصیبی ورنہ زمین کسان کی آسمان نوجوان کا، کمان انسان کی تیر شیطان کا اور گردن آپ کی۔ "لیڈر دل کا کیا پوچھنا ان کو ہار پہنایئے، نعرے لگایئے، ووٹ دیجئے اور جو چاہے کہلوا لیجئے یہاں سب سے انوکھی بحث کرنی ہے یعنی بات ایسی ہو جو گنوار، تعلیم یافتہ، بچے، نوجوان، بوڑھے، خواتین، حاکم محکوم سب کے لئے یکساں مفید اور دلچسپ ہو۔ کمیٹی کے اراکین اور ریڈیو کے سامعین دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کون اور کس قسم کے لوگ ہوں۔ فرض کیجئے میں تو گنوار کو سمجھا رہا ہوں نوجوان یہ سمجھیں کہ ان کی توہین ہو رہی ہے، اگر ان کی طرف متوجہ ہوں تو بوڑھے بگڑ کھڑے ہوں، بوڑھوں کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کروں تو بچے تالیاں بجانے لگیں، نوجوان سے مخاطب ہوں تو بگڑی فریاد کرنے لگے محکوم سے بولوں تو حاکم گرفتار کرے اور حاکم سے گفتگو کیجئے تو "نورٌ علیٰ نور"، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ کمیٹی اور کانفرنس کا میں نے مضحکہ ضرور اڑایا ہے۔ لیکن میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو شراب کے عیوب بیان کرنے میں اس کی خوبیاں نظر انداز کر جاتے ہیں، میں تو اکثر مواقع پر ہنر بیان کرتا ہوں اور عیب سے درگزر کرتا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں ایک موقع شراب کا بھی ہوتا ہے اور یہ میں اس لئے کہہ دیتا ہوں کہ

شراب کی دوکان بڑھ چکی ہے۔ لیکن تہمت شراب اب بھی باقی ہے۔ اس میں شک نہیں، کونسل اور کمیٹیوں میں بعض بڑی خوبیاں بھی ہیں۔ بشرطیکہ جو بات طے پائے وہ کمیٹی اور کونسل کا بے لاگ فیصلہ ہو، نہ یہ کہ فیصلہ پہلے ہو چکا ہو، گواہی جرح اور بحث بعد میں ہو۔ عام طور پر دیکھا یہی جا رہا ہے کہ جو مقصد کسی خاص شخص یا جماعت کے مدنظر ہوتا ہے وہی بالآخر کمیٹی یا کمیشن کا فیصلہ ہوتا ہے یعنی عقل مند جو فیصلہ کرتا ہے اس کا اعلان بیوقوفوں سے کرایا جاتا ہے۔ میں سیاسیات یا قومیات کا نہ معلم ہوں نہ مداری لیکن سیاسی اور قومی بازی گری کے تماشے دیکھتا رہتا ہوں۔ نت نئے تماشے ہم سب سیاسی اور قومی حقوق و اختیارات کو پہچانتے تو خوب ہیں لیکن ان کا سزاوار بننے کے لئے جس محنت خلوص یا رواداری کی ضرورت ہوتی ہے اس کے متحمل نہیں ہوتے ہم "گفتم و شد" چاہتے ہیں "کردم و شد" کی زحمتوں سے بچنا چاہتے ہیں ہم مختلف الخیال لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر نہ عقل کی باتیں کرتے ہیں اور نہ خلوص کا ثبوت دیتے ہیں۔ دوسروں کی بات سننے اور اپنی بات منوانے میں جس تحمل، جس وسعت نظر اور جس فکر و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے ہم اُن سے سر چھپاتے ہیں

ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کمیٹی میں بیٹھ کر صحیح دلائل سے دوسروں کو قائل کر سکتے ہوں۔ ہم اپنے نقطۂ خیال کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھنے سے گھبراتے ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کیلئے

جس محبت اور اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم میں نہ ہو، بُرا کہنے سے بھلا بننا زیادہ مشکل ہے۔ یاد رکھئے دنیا کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے اختلافات سہنے اور سلجھانے پڑیں گے۔ مجھ سے خفا نہ ہوجئے اقبال کو دعا دیجئے۔ جس نے کچھ سمجھ کر ہی کہا ہوگا ؎

تری دعا ہے کہ ہو میری آرزو پوری
مری دُعا کہ تری آرزو بدل جائے

رشید احمد صدیقی

عبدالمجید سالک

مولانا عبدالمجید سالک ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ منشی غلام قادر مرحوم آپ کے والد تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم پٹھان کوٹ اور بٹالہ میں حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے السنہ شرقیہ اور بی۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔ ادب کا شوق شروع ہی سے تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے ہمیشہ سالک صاحب کی ہمت افزائی کی اور ان کو اپنے اخبار زمیندار کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ عبدالمجید سالک نے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۷ء تک زمیندار کی ادارت کی اور ۱۹۲۷ء میں اپنا اخبار انقلاب جاری کیا۔ انقلاب بیس سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہ کر تقسیم برصغیر کے بعد بند ہو گیا۔

مولانا عبدالمجید سالک نے اردو صحافت کے خد وخال کو سنوارا ان کے "افکار وحوادث" اپنی ادبی چاشنی کی وجہ سے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ سالک صاحب نے ٹیگور اور دوسرے مصنفین کی کتابوں کے ترجمہ سے اردو ادب کے دامن کو اور وسیع کر دیا۔

عبدالمجید سالک کی ذات ایک ادارہ کی حیثیت رکھتی ہے ہمارے دور کے کتنے ہی ادیب انہیں اپنا مشیر بلکہ مرشد

سمجھتے ہیں۔

مولانا سالک نے سرگذشت کے نام سے اپنے حالات لکھے ہیں یہ کتاب ہمارے سوانحی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ محض سالک صاحب کے حالات کا مجموعہ نہیں بلکہ ہماری قومی زندگی کا ایک ہنگامہ خیز دور اس سرگزشت میں سمٹ آیا ہے۔

مجھے یاد ہے

غالباً میری عمر گیارہ برس کی ہو گی کہ مجھے والد اپنے ساتھ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں لے گئے۔ وہ زمانہ سیاسی اعتبار سے نہایت پرسکون تھا۔ کوئی سیاسی تحریک نہ تھی۔ سرسید کی حکمتِ عملی کے تحت مسلمان ہر جگہ غیر سیاسی تنظیم اور اشاعتِ تعلیم میں مصروف تھے۔ انہی دنوں ایک دفعہ شیخ عبدالقادر پٹھان کوٹ آئے اور ہمارے ہاں قیام کیا۔ دو دن میں ایک انجمن اتفاقِ اسلام کی بنیاد رکھ دی گئی جس کے صدر منشی عزیز الدین رئیس اور سکریٹری میرے والد قرار پائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس زمانے میں بھی ان بزرگوں کو اپنے کلچر کے تحفظ کا اتنا خیال تھا کہ وہ اس انجمن کے عہدداروں کو پریذیڈنٹ اور سکریٹری کہنے کی بجائے میر مجلس (پریذیڈنٹ) دبیر مجلس (سکریٹری) امین مجلس (خزانچی) اور نقیبِ مجلس (خادم انجمن جو ممبروں کو بلا کر لایا کرتا تھا) کہا کرتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کو مسلمان اپنا سب سے بڑا قومی

سیلہ سمجھتے تھے اور اپنے بچوں کو بھی اس جلسے میں لے جایا کرتے تھے۔ تاکہ بزرگان قوم کے خیالات آغاز ہی سے ان کے کانوں میں پڑ جائیں مجھے یاد ہے کہ اس سالانہ اجلاس میں مولانا حالی اور میرزا ارشد گورگانی بھی تشریف لائے تھے۔

مولانا حالی کی مقدس اور پاکیزہ صورت اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے سر پر چھوٹی سی نیلٹ ٹوپی، بند گلے کا ایک سادہ سا کوٹ اور گلے میں ایک رومال بندھا ہوا۔ سفید پُر نور ڈاڑھی اور نہایت رحیم و شفیق بُشیرہ، سوءِ اتفاق کہ حضرت نے جو نظم، جلسے کے لئے لکھی تھی۔ وہ بھولے سے پانی پت ہی چھوڑ آئے۔ اور یہاں پہنچ کر بہت پریشانی ہوئی۔

خیر مولانا حالی نے اپنا کلام سنایا اور لوگوں نے اس چراغ سحری کی روشنی کو بھی غنیمت سمجھا۔ خصوصاً میں کہ درسی کتابوں میں حالی کی نظمیں پڑھا کرتا تھا۔ حضرت کی زبان سے ان کا کلام سُن کر بالکل ہی مست ہو گیا

اس کے بعد جب والد صاحب مجھے دوسری دفعہ انجمن کے جلسے میں لائے تو وہ غالباً اکیسواں سالانہ جلسہ تھا۔ اس کے واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لا، کی بے حد طویل مگر دلچسپ تقریر ہوئی آغا شاعر قزلباش نے اپنی نظم "یتیم کی فریاد" پڑھی۔ خوب نظم تھی۔

اس اجلاس میں ایک بہت دلچسپ واقعہ ہوا۔ جو مجھے اب تک یاد ہے۔ خواجہ دل محمد صاحب ان دنوں کوئی انیس بیس سال کے نوجوان تھے اور اسی سال انہوں نے ریاضی میں ایم۔ اے کر کے برادران وطن کے اس طعنے کا موثر جواب مہیا کیا تھا۔ کہ مسلمانوں کو حساب نہیں آتا۔ خواجہ صاحب

کی ایک خصوصیت خاص طور پر حیرت انگیز تھی۔ کہ وہ ریاضی جیسے خشک مضمون کے ساتھ ہی ساتھ بحر شاعری کے بھی شناور تھے۔ اس سال انہوں نے ایک پاکیزہ مسدس "کلک گہربار" کے نام سے پڑھی۔ جس پر بہت پُرشور داد ملی اور انجمن کو چندہ بھی خوب ملا۔ اس اجلاس میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد بھی دہلی سے آئے ہوئے تھے، سر پر چوگوشیہ ٹوپی۔ چہرے پر مجتمع سفید ڈاڑھی، لمبا سیاہ چغہ جو غالباً ایل ایل ڈی کا گاؤن تھا۔ آپ نے تقریر شروع کی تو دلآویز اندازِ بیان کی وجہ سے سارا جلسہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ آپ نے فرمایا۔ خواجہ دل محمد بہت ذہین اور لائق جوان ہیں اور شاعری فی نفسہ بری چیز نہیں۔ حسان بن ثابت حضرت رسولؐ خدا کے شاعر تھے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جو دماغ زیادہ علمی علوم کے لئے موزوں ہے۔ اسے شعر کے بےکار شغل میں کیوں ضائع کیا جائے اس پر حاجی شمس الدین اٹھے اور کہا کہ شعر چونکہ سلمہ طور پر نثر سے زیادہ قلوب پر اثر کرتا ہے۔ اس لئے یہ بھی مقاصد قومی کے حصول کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی نظم پر انجمن کو اتنے ہزار روپیہ چندہ وصول ہوا جو دوسری صورت میں شاید نہ ہوتا۔

اس پر مولانا نذیر احمد کسی قدر تاؤ کھاگئے۔ اور کہنے لگے۔ حاجی صاحب۔ چندہ جمع کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ جو شخص خدمت میں ثابت قدم رہتا ہے اس کی بات قوم پر ضرور اثر کرتی ہے۔ یہ کہا اور عجیب دردناک انداز سے اپنی چوگوشیہ ٹوپی، تاری۔ اور فرمایا، کہ یہ ٹوپی جو حضور نظام خلد اللہ ملکہ، کے سامنے بھی نہیں اتری۔ محض اس غرض سے اتارے دیتا ہوں کہ اس کو کاسۂ گدائی

بنا کر قوم سے انجمن کے لئے چندہ جمع کیا جائے۔ فقیر آپ کے سامنے موجود ہے کچکول اس کے ہاتھ میں ہے۔ دے دو بابا۔ تمہارا بھلا ہوگا۔

بس پھر کیا تھا۔ جلسے میں بے نظیر جوش پیدا ہو گیا ٹوپی مولانا کے سر پر رکھی گئی اور ہر طرف سے روپیہ برسنے لگا۔ یہاں تک کہ حاجی شمس الدین کی آواز اعلان کرتے کرتے بیٹھ گئی اور جب ذرا جوش کم ہوا۔ تو مولانا نے پھر تقریر شروع کی اور ہنس کر حاجی صاحب سے کہا" اس نظم کے بعد ہماری نثر بھی آپنے سُنی؟

انہی دنوں میں نے والد سے کہا۔ کہ میں مولوی محمد حسین آزاد کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کہنے لگے۔ آج کل مولوی صاحب کا دماغ درست نہیں۔ خدا جانے کہاں آوارہ گردی کر رہے ہوں گے۔ تم کہاں ان کو ڈھونڈتے پھروگے۔ میں نے کہا کہ کل صبح ان کے گھر پر چلیں شاید نظر آجائیں۔ دوسرے دن والد مجھے اکبری منڈی میں مولانا کے مکان پر لے گئے۔ وہاں ایک نہایت پاکیزہ صورت خوش پوش لڑکا کھڑا تھا (بعد میں معلوم ہوا کہ آغا طاہر تھے) اس سے والد نے پوچھا "میاں مولانا آزاد کہاں ہیں"؟ لڑکے نے مودبانہ عرض کیا حضرت وہ تو صبح ہی صبح نکل جاتے ہیں اور اکثر شام ہی کو لوٹتے ہیں والد نے مجھ سے کہا۔ سُن لیا تم نے اب چلو وقت ضائع نہ کرو۔ وہاں جلسہ شروع ہو رہا ہوگا۔

اسی دن تیسرے پہر جب میں والد کے ساتھ انار کلی بازار کی ایک دکان پر بیٹھا تھا۔ اور والد بعض چیزیں خرید رہے تھے۔ ایک دم والد نے مجھ سے کہا" دیکھو۔ مولانا آزاد جا رہے ہیں"۔ میں نے گردن پھیر کر دیکھا تو ایک مہندی لگی ڈاڑھی والے بزرگ" بائیں پگڑی باندھے لمبا چوغہ پہنے انار کلی بازار

کے عین درمیان نہایت تیز رفتاری سے چلے جارہے ہیں۔ میں ان کی زیارت کے لئے اندھا دھند بھاگا۔ اور تھوڑی دور پہنچ کر اُن کو جا لیا۔ جب میں نے آگے بڑھ کر مولانا کو آداب عرض کی۔ تو ایک دم ٹھیر گئے اور کہنے لگے۔ میاں صاحبزادے کیا چاہیے؟ میں نے کہا۔ صرف حضرت کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ کہنے لگے۔ "سنو میاں صاحبزادے انسان وہ بات کرے، جس میں کہنے والے کو بھی فائدہ ہو اور سننے والے کو بھی فائدہ ہو۔" یہ فقرہ مولانا نے تین دفعہ دہرایا۔ اس کے بعد کہنے لگے۔ "بس ہو چکی زیارت بھاگ جاؤ۔" میں بھاگ گیا۔

————— عبدالمجید سالک

سیّد امتیاز علی تاج

سید امتیاز علی تاج لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شمس العلماء سید ممتاز علی تھے جنہوں نے دو رسالے جاری کیے۔ عورتوں کے لیے تہذیب نسواں اور بچوں کے لیے پھول۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ امتیاز علی تاج اُسی ادبی ماحول میں پلے اور شروع ہی سے لکھنے پڑھنے میں دلچسپی لیتے رہے۔

امتیاز علی تاج نے شروع میں ترجمے کیے، افسانے لکھے، اور اُردو کے مزاحیہ ادب کو چچا چھکن کا کردار دیا۔ چچا چھکن کا کردار مرزا ظاہر دار بیگ اور حاجی بغلول کے بعد اُردو ادب کا سب سے مشہور مزاحیہ کردار ہے۔

انارکلی تاج صاحب کی ادبی زندگی کا شاہکار ہے۔ اسے بیسویں صدی کے اُردو ادب کا سب سے بہتر ڈرامہ قرار دیا گیا ہے۔ تاج نے اپنے قلم سے ماضی کو زندہ کر دیا ہے، واقعات تاریخ کے پردوں سے اُبھر کر ہمارے سامنے یوں آجاتے ہیں جیسے یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔ فنی طور پر یہ بہت کامیاب ڈرامہ ہے اس میں وحدت زمان و مکاں بھی ہے اور وحدت کردار بھی۔ تمثیل نگار نے معمولی سے معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور انارکلی چھوڑ کر

ہم کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ تاریخ ادب کا رومان ہے۔

انارکلی

(سلیم کا مثمن برج والا ایوان)

(باہر نیلے آسمان اور مسجد کے گنبد اور میناروں پر دھوپ کہہ رہی ہے کہ دن چڑھ چکا۔ اندر سلیم تخت پر بیہوشی کی حالت میں یوں پڑا ہے۔ گویا کہیں سے لاکر لٹا دیا گیا ہے۔ ذرا سی دیر بعد حرم کی طرف کے دروازے کے پردے ہٹتے ہیں اور دل آرام سر نکال کر اندر جھانکتی ہے۔ جب اطمینان ہو جاتا ہے کہ سلیم غافل ہے تو دبے پاؤں اندر آتی ہے اور آہستہ آہستہ پنجوں کے بل چل کر سلیم کے قریب پہنچ کر تھم جاتی ہے۔)

دلآرام۔ تو غافل سو رہا ہے۔ اور موت کا منہ تیری انارکلی پر بند ہو چکا ہے تیری زندہ انارکلی کے گرد اینٹیں اور پتھر چُنے گئے، اور اس کا حُسن خاک میں غروب ہو گیا۔

(سلیم کروٹ بدلتا ہے دلآرام حرم کے دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ مگر رخصت ہونے کو جی نہیں مانتا۔ آخر جلدی سے بڑھتی اور ورلے دروازے کے پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے)

سلیم۔ (آنکھیں کھول دیتا اور ذرا دیر چپ چاپ پڑا ساکن نظروں سے چھت کو تکتا رہتا ہے۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور چونک کر حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے) یہ کیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟ ——— اب میں یہاں ہوں۔ یہ کیا

اسرار۔ کیسے ہوا؟ مجھے ابھی معلوم ہونا چاہیے۔

(باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بھاگتا ہے۔ دروازہ میں سے ایک سپاہی تلوار لیے ہوئے نکل آتا ہے اور جھک کر تعظیم بجالاتا ہے۔)

سپاہی۔ صاحب عالم اس ایوان سے باہر نہیں جاسکتے۔

سلیم۔ کیوں؟

سپاہی۔ ظلِ الٰہی کا فرمان ہے۔

سلیم۔ (جلال کے عالم میں) میں جاؤں گا۔

سپاہی۔ (سکون سے) کوشش بے سود ہے۔ ہر طرف مسلح سپاہی ہیں۔

سلیم۔ آہ! میں اسیر ہوں۔ بے دست ہوں۔ خداوندا!!!

(مسند پر گر پڑتا ہے)

(بختیار داخل ہوتا ہے۔ چہرے پر فکر و تردد ہے)

بختیار۔ سلیم!

سلیم۔ آہ! تم بختیار! تم آگئے میرے دوست! مجھے بتاؤ۔ نہیں جانتا کیا کیا پوچھوں؟ سب کچھ بتاؤ۔ نہیں پہلے بتاؤ وہ زندہ ہے؟

بختیار۔ امیدیں، آرزوئیں، اُمنگیں، حوصلے، سب مٹ گئے۔ سلیم! تمہارا سب کچھ فنا ہوگیا۔

(سلیم کھڑا کھڑا سامنے کو گرنے لگتا ہے بختیار سلیم! سلیم! کہتا ہوا بڑھتا ہے اور اُسے سنبھال لیتا ہے۔)

میرے شہزادے! میرے بادشاہ! ہوش میں آؤ۔ مرد بنو۔

سلیم ۔ مجھے تم سے کچھ کام ہے ۔

بختیار ۔ (سلیم پر نظریں گاڑے ہوئے) کیا؟

سلیم ۔ ایک خنجر لا دو ۔

بختیار ۔ (اُٹھ کر سلیم کے سامنے آ بیٹھتا ہے) تم کیا سوچ رہے ہو؟

سلیم ۔ کچھ نہیں ۔ مجھے انارکلی کے پاس پہنچنا ہے ۔

بختیار ۔ سلیم! خدا کے لیے ــــــــ

سلیم ۔ (غصہ سے) خنجر لاؤ یا دور ہو جاؤ ۔

بختیار ۔ (سلیم کے غصہ سے ڈر کر کھڑا ہو جاتا ہے) سلیم! مجھ پر رحم کھاؤ ۔

سلیم ۔ (یوں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جیسے رُک جانے کے بعد زندگی ریلا کر کے اُس کے جسم میں واپس آ گئی ہو) کچھ نہیں یہاں سے نکل جاؤ (بختیار کو نکالنے کے لیے اُس کی طرف بڑھتا ہے ۔ حرم کے دروازہ سے ثریا داخل ہوتی ہے ۔)

(سلیم ثریا کو دیکھ کر اُس کی طرف بڑھتا ہے)

ثریا ۔ (وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ اُٹھا کر) میرے قریب نہ آ ۔

سلیم ۔ (حیرت میں) کیا؟

ثریا ۔ تیمور کی نامرد اولاد! ہندوستان کے بُزدل ولی عہد! میری بہن کی جان لے کر تو ابھی زندہ موجود ہے ۔ جھوٹے! تو نے اس کو بچا لینے کا وعدہ کیا تھا ۔ اس کوشش میں تو نے اپنی جان تک دے دینے کو کہا تھا اور سب قول یوں پورے ہوئے؟ جوان انارکلی کے' انارکلی کی بُڑھیا

ماں کے قاتل! تجھ پر بے کس کا صبر ٹوٹے، تجھ کو مظلوم کی آہیں پھونکیں، تجھ کو بے بس کے آنسو غرق کریں۔

بختیار۔ لڑکی! خاموش۔ خاموش۔

سلیم۔ (سر جھکا کر) ثریا! دنیا کی کوئی لعنت، کوئی بددعا باقی نہ چھوڑ! اور جب تیرا دل بھر جائے تو صرف اتنا کر۔ مجھے اپنی انارکلی کے راستے پر لگا دے میری ثریا! میرا راستہ کھو گیا۔

ثریا۔ ظالم اکبر کے دروغ گو بیٹے! تجھے راستہ نہیں ملتا۔ میری جیتی جاگتی بہن کے گرد دیوار چن ڈالی گئی۔ وہ ناشاد زندہ گاڑ دی گئی۔ اس کی "سلیم سلیم!" کی آخری چیخیں آسمان میں شگاف کرتی رہیں۔ اور تو یہاں پردوں میں گدیلوں پر جان کو لیے بیٹھا ہے۔

سلیم۔ زندہ دیوار میں؟ پناہ تیری! میرے گرد کس جہنم کا منہ کھل گیا۔

ثریا۔ وہ تھرتھراتی ہوئی نازنین پتھروں میں ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئی۔ اس کا دھڑکتا ہوا دل، دوڑتا ہوا لہو دیوار میں غرق ہونے کے بعد تھم گیا۔ اور تجھے اس کا راستہ نہ ملا۔ موت نہ آئی۔

سلیم۔ (پاگلوں کی طرح کبھی اپنے آپ سے کبھی بختیار سے) دیوار بند ہو گئی۔ اس پر دیوار بند ہو گئی۔ میرا دم گھٹتا۔ دم گھٹتا۔

بختیار۔ سلیم! سلیم! تمہیں کیا ہو گیا۔ نامراد لڑکی! تو نے کیا کر دیا؟

ثریا۔ خوشا دی کتے! میری بہن کی روح دوسرے جہان میں اس کے لیے بیتاب ہے۔ میں اپنے آخری سانس کو اس کے لیے لعنت بناؤں گی۔ میں اس کے

لیے زندگی کو موت سے بدتر بنا دوں گی۔ میں اسے خود کھینچ کر موت کے منہ میں لے جاؤں گی (سلیم بختیار کی آغوش سے یک لخت الگ ہو کر دیوانہ وار دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

بختیار۔ سلیم! کہاں جا رہے ہو؟

سلیم۔ میں اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ قلعے کو کھنڈر بنا دوں گا۔

بختیار۔ راہ بند ہے۔

سلیم۔ راہ بند ہے تو میری ٹکریں راہ بنائیں گی۔ (پردہ دیوار پر سے نوچ ڈالتا ہے۔ دیکھتا ہے تو پیچھے دلآرام سہمی ہوئی کھڑی اس کے جنون کو دیکھ کر کانپ رہی ہے) انارکلی!

ثریا۔ اندھے! یہ انارکلی ہے یا وہ سموم جس نے انارکلی کو پھونک ڈالا۔ دلآرام، انارکلی کی قاتل تیرے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے انارکلی کو گرفتار کرایا جشن کی رات یہ اکبر کے حضور میں موجود تھی۔ اس نے قتل کا حکم دلوایا۔ کل رات یہ اکبر کی خوابگاہ میں گئی تھی۔ انارکلی کا سانس بند ہے اور یہ سانس لے رہی ہے۔ انارکلی کے جسم سے زندگی کی آخری رمق مٹ چکی اور اس کے جسم میں لہو جاگ رہا ہے۔ مار! مار! میرا کلیجہ ٹھنڈا کر! انارکلی کی موت کی جلن کو مٹا!

دلآرام۔ (تھرتھر کانپتے ہوئے) میں نے محبت کی سزا نہیں دلوائی داروغۂ زنداں نے دلوائی ہے۔

سلیم۔ (لپک کر اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا ہے اور دبانا شروع کرتا ہے) آخر کار، آخر کار، انارکلی کو گھونٹ ڈالنے والے پتھر! تو مجنون سلیم کے ہاتھ آگیا۔ اب اس کے ہاتھ تیرے خون کی ایک ایک بوند سے انارکلی کا انتقام لیں گے۔

امتیاز علی تاج

پطرس

پطرس کا نام سید احمد شاہ بخاری ہے ۔ یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پشاور میں پیدا ہوئے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم ۔ اے کیا اور ساری یونی ورسٹی میں اوّل آئے ۔ کیمبرج یونی ورسٹی سے علمی اعزاز کے ساتھ آنرز کیا ۔ اُس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ادبیاتِ انگریزی کے اُستاد ہو گئے ۔ شعبۂ تعلیمات کو چھوڑ کر ریڈیو میں نوکر ہو گئے، اور ترقی کر کے تقسیم سے پہلے آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل ہو گئے ۔ پاکستان بننے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہوئے ۔ اس کے بعد وہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے مقرر کیے گئے اور آج کل وہ اقوامِ متحدہ کے اسسٹنٹ سکریٹری جنرل ہیں ۔ وہ پہلے پاکستانی ہیں جسے اتنا بڑا عالمی اعزاز عطا ہوا ۔

پطرس کم نویس ہیں ۔ اُن کی ادبی شہرت گنتی کے چند مضامین پر قائم ہے ۔ لیکن یہی چند مضامین اُردو کے مزاحیہ ادب میں ایک نئے باب کا درجہ رکھتے ہیں ۔ پطرس نے ایک نیا اسلوب قائم کیا ۔ وہ زندگی کے معمولی اور روزمرّہ کے واقعات میں مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں ۔ اس لیے انھیں اُردو ادب کا اسٹیفن لیکاک کہا جا سکتا ہے ——— زبان اُن کے مزاح میں شہ رگ کا درجہ رکھتی ہے ۔

بطرس کے مزاح کو ہم کوئی خاص نام نہیں دے سکتے۔ اُن کا مزاح ایک ذہنی کیفیت ہے —— "مرحوم کی یاد میں"، "لاہور کا جغرافیہ" "مرید پور کا پیر" اور "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" یہ مضامین اُردو کے مزاحیہ ادب میں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی!

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف اُٹھ بھاگتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہم چاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ "لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے" وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اُٹھتے ہی اُنہوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکّہ بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر، جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا۔ اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر رینڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آبا و اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اُٹھی ہوگی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں۔ "اچھا اچھا! ..... تھینک یُو! ..... جاگ گیا ہوں! ...... بہت اچھا! نوازش ہے!" آنجناب ہیں کہ سنتے ہی میں نہیں آتے۔ خدایا!

کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوئے ہوئے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جِلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسےٰ بھی تو واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قُم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو مردے کے پیچھے لٹھ لے کر تھوڑی پڑ جایا کرتے تھے؟ تو ہیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ ہم سے کیسے ہو سکتا تھا کہ اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر بجھانا بجھانا پڑتا ہے اس کا اندازہ کچھ اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخرِ کار جب لمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا۔ کہ آج پتہ لگائیں گے۔ یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشن دان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سُنی تھیں ان میں سے ایک بھی نظر نہ آئی۔ تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی "لالہ جی! ..... لالہ جی! .... جواب آیا "ہوں"

میں نے کہا "آج کیا بات ہے کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟" کہنے لگے۔

"تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے"

تین بجے کا نام سُن کر ہوش گم ہو گئے چونک کر پوچھا "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟" کہنے لگے "تین تو ...... نہیں ...... کچھ سات ...... ساڑھے سات ...... منٹ اوپر تین ہیں"

میں نے کہا "ارے کم بخت۔ خدائی فوجدار بدتمیز کہیں کے!

میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اُٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے! تین بجے اُٹھ کے ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیرزادے ہیں کوئی مذاق تھوڑا ہے" ——— دل تو چاہتا تھا کہ عدمِ تشدد و تشدد کو خیرباد کہہ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوعِ انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے اور پھر حسبِ معمول نہایت اطمینان کے ساتھ تھکے ہارے کی طرح اپنا دس بجے اُٹھے۔ بارہ بجے تک ہاتھ مُنہ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوشِ شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی۔ "مسٹر"! ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس اُنگلیاں وہیں پر رُک گئیں۔ اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں؟ (زور "آپ" پر) میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمائیے؟" بولے ذرا...... وہ..... میں..... میں "ڈسٹرب" ہوتا ہوں"۔

بس صاحب! ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مرگئی۔

دل نے کہا "او نابکار انسان! دیکھ پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں" خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لیے۔ نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھا لیں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ۔ سبز۔ زرد سب ہی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے ترتیب سے کتابوں کو میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد کو لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ اپریل تک دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھیں؟ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ پر ملامت کی۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغویات ہے البتہ پانچ، چھ، سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ہم خرما و ہم ثواب۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی کو جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوتِ ارادی نہایت زبردست ہے۔ جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!" انہوں نے پتھر کھینچ مارا۔

"یس" ہم اور سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی! صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں ......"

جواب ندارد

میں نے پھر کہا "جب چھ بج چکیں تو ...... سنا آپ نے؟" مگر چُپ ——

"لالہ جی" کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ "سُن لیا۔ سُن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس فورا یلفا پلس —"

ہم نے کہا "ب۔ ب۔ ب بہت اچھا — یہ بات ہے" توبہ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے اُنھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ اُن کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہرصورت جیسا کہ میرا فرض تھا میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اُنھوں نے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔ اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں۔ اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اُٹھنے سے پہلے دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا نہیں پتہ۔ شاید لحاف اوپر سے اُتار دیا یا شاید سر اس میں لپیٹ لیا۔ شاید کھانسا کہ خدا جانے خرّاٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے +

احمد شاہ بخاری پطرس

ادبی خطوط

خطوں کے آئینے میں

خطوط اور اُن کی اہمیت از ڈاکٹر عبدالحق

- غالب
- میر مہدی مجروح
- غلام غوث بے خبر
- سر سیّد احمد خاں
- ڈپٹی نذیر احمد
- مولانا محمد حسین آزاد
- داغ دہلوی
- مولانا حالی
- علّامہ شبلی نعمانی
- اکبر الہ آبادی
- مولانا محمد علی
- چکبست
- پریم چند
- علامہ اقبال
- خواجہ حسن نظامی
- مولانا ابوالکلام آزاد

خطوط اور اُن کی اہمیّت

ادب میں سینکڑوں دلچسپیاں ہیں۔ اس کی بے شمار ادائیں ہیں اور اَن گنت گھاتیں ہیں لیکن خطوں میں جو جادو ہے (بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔ نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو۔ غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بناوٹ کی باتیں بہت جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ صرف سادگی ہی ایسا حسن ہے جسے کسی حال اور کسی زمانے میں زوال نہیں بشرطیکہ اس میں صداقت ہو اور ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟ یہ ہمارے خمیر میں ہے۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے جھوٹ بولے۔ یہی وہ فطری تقاضا ہے کہ بعض اوقات ہم ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دلکش سے دلکش نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول کو اٹھا کے الگ رکھ دیتے ہیں۔ ہماری ہر تصنیف و تالیف ہماری ہر علمی و ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے، غیروں کے لئے ہے اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گی۔ اس لئے مصلحتِ وقت کا بھی خیال ہوتا ہے، عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے، تکلفات بھی برتنے پڑتے ہیں، خیال کو صاف صاف لکھنے کی بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی

نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ وہ ہر مسئلہ اور ہر شے کے متعلق جیسا اس کا خیال ہوتا ہے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے نہ دوسروں سے چوکتا نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے۔ اس وقت اسے نہ خوف لائم ہوتا ہے اور نہ نکتہ چین کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھا لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے —— نہیں بلکہ اپنا دل وہ کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو۔ جس میں ہمدردئ بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کے بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔

عبدالحق (بابائے اردو)

غالب کے خطوط

مرزا حاتم علی مہر کے نام

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب
اے تو غائب ز نظر مہر تو ایمان منست

حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا۔ جانتے ہو کہ مرزا محمد یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا اس کا منشا کیا ہے۔ کبھی میں نے بزمِ احباب میں کہا ہو گا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرحدار آدمی ہیں اور بھائی تمہاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کے نوکر تھے۔ اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھے دکھلائے۔ بہر حال تمہارا حلیہ دیکھکر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے؟ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری بقول شیخ علی حزیں

۵ تا دسترسم بود زدم چاک گریباں!
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے۔ عام ملّا۔ حافظ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقہ۔ بھٹیارہ۔ جولاہہ۔ کنجڑا۔ منہ پر ڈاڑھی۔ سر پر بال فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی، اسی دن سر منڈوادیا۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللّٰہ العلی العظیم۔ غالبؔ

میر مہدی مجروح کے نام

بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، مجمع بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میں میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھئے کہاں اترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں۔ اگلے دربار میں سات سات جاگیردار تھے۔ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر۔ بہادر گڑھ۔ بلب گڑھ۔ فرخ نگر۔ دوجانہ۔ پاٹودی۔ لوہارو چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے ان میں سے دوجانہ ولوہارو تحت حکومت ہانسی، حصار، پاٹودی حاضر اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئیں تو تین ورنہ ایک رئیس دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہلِ اسلام میں سے صرف تین لوگ باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفٰے خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں۔ بلی ماروں میں



اسداللہ خاں غالب

سگِ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود، مطرود، محروم و مغموم ؎

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا

آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

تم آتے ہو چلے آؤ جانثار خاں کے چھتے کی سڑک، خاں چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ، بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا، حکیم الملک میر اشرف علی کو دعا، قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا، یوسف ہند میر افضل علی کو دعا

"غالب"

جوابِ مجروح

قبلہ و کعبہ! آداب بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں حضرت اتوار نہیں ہوتا نہ ہو پھول والوں کی سیر موقوف ہو گئی بلا سے۔ گذری نہیں جمتی۔ چاندنی چوک کی گرمی بازار نہ رہی نہ سہی، اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ دلی کی ہستی تو آپ کی ذات پر منحصر ہے جب آپ کو دیکھ لیا سب کو دیکھ لیا۔ اگر غم ہے تو اس کا ہے اور گردشِ روزگار سے شکوہ ہے تو یہ ہے کہ آپ کی قدم بوسی سے محروم رکھا اور ملاقات ہر روزہ سے مایوس کیا نہ کسی کی صحبت خوش آئے نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہے۔ ہر روز وہی ہنگامے پیشِ نظر رہتے ہیں اور وہی یارانِ جلسہ آنکھوں میں پھرتے ہیں، ادھر یوسف مرزا غل مچاتے ہیں، ادھر سے یار عزیز چلے آتے ہیں، کسی کونے میں اسد ایرج کھڑے ہیں۔ کسی گوشے میں میاں موش خاموش بیٹھے ہیں [illegible] کے یتر کچھ الجھ الجھ کے سبق پڑھ رہے ہیں۔ ادھر ادھر کے لوگ آتے ہوئے [illegible] و جوانب کی یہ کہہ رہے ہیں میر حسین

مے کش، شوخی، ثقاہت میں لبریز گفتگو ئے بین بین میں سرگرم۔ کسی کے چھیڑنے کے لئے نئی نئی تمہیدیں اٹھاتے ہیں۔ کسی کو صاحب و قبلہ کہہ کے پاس بٹھاتے ہیں۔ کیوں حضرت! وہ بھی کیا زمانہ تھا اور کیا خوب بسر ہوتی تھی۔ ہر روز ہنسنے بولنے کا ہنگامہ گرم نہ کوئی اندیشہ، نہ کوئی غم، اب ان مزوں کا یہ بدلہ ہے کہ ہر ایک کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں اور ہر ایک کی جدائی میں بن آئی مرتے ہیں۔ نہ یہ امید کہ پھر ایک جگہ مل بیٹھیں گے۔ نہ یہ توقع کہ پھر ان صورتوں کو دیکھیں گے۔ اب سیر تماشے کی آرزو کسے، اور وہ دل و دماغ کجا۔ ایسا زمانے نے خاک میں ملایا کہ پھر ہنسنے بولنے کی امید ہو؎

تیرے بے خود جو ہیں سو کیا چیتیں

ایسے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں؟

خدا شاہد ہے کہ پہروں اسی فکر میں پڑا رہتا ہوں کہ پھر بھی وہ دن ہوگا کہ ایک جگہ چار ہم صورت اکھٹے ہوں۔ کہ یہ چند روز حیات کے اگر بافراغت نہیں تو بے غم ہی بسر ہوں مگر کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اگر کوئی سبب نکالے تو کیا عجب ہے۔ خیر حضرت یہ رونا تو تمام عمر کا ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ نواب گورنر جنرل آنے والے ہیں۔ کچھ آپ کے مقدمے کی سلسلہ جنبانی ہوئی؟ پنشن ملنے کی صورت نکلی؟ یہ عقدۂ لاینحل بھی کبھی حل ہوگا یا میری خاطر کی طرح منعقد رہے گا؟ میر اشرف علی اور میر نصیر الدین اپنے اپنے القابوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور تسلیم بصد تعظیم بجا لاتے ہیں۔ سوائے میرن صاحب کے کہ انھوں نے اپنے خطاب سے بہت آنکھ بھوں چڑھائی اور کہا کہ جناب میرزا صاحب قبلہ بھی نہیں پرانی آشنا بیہ مستعملہ کا استعمال رکھتے ہیں۔ جن کی سینکڑوں نے اپنے دوست، آشناؤں کو نسبت دی ہے۔ پھر میری

خصوصیت کیا ہے؟ اور اس پر بھی نرا یوسفِ ہند، اگر یوسفِ زمانہ یا یوسفِ کشور لکھتے تو بھی مضائقہ نہ تھا۔ فقط

زیادہ حدِ آداب

فدوی میر مہدی مجروح

میر مہدی مجروح کے نام

میر مہدی! جیتے رہو، آفریں صد آفریں! اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک کرنے لگا۔ سنو دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔ میری پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کما حقہ، سمجھ لو۔ "و للہ حمان الطاف خفیہ" ایک طرزِ خاص پر تحریک ہوئی۔ سر رشتے کی پابندی ضروری ہے۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکمِ پنجاب کو لکھا کہ حاکمِ دہلی سے فلاں شخص کے پنشن کے کل چڑھے ہوئے روپے ایک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بماہ روپے ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھکر ہمارے پاس بھیجدو تاکہ ہم حکم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیجدیں۔ یہاں اس کی تعمیل فوراً بطرزِ مناسب ہو گئی۔ کم و بیش دو مہینے میں روپیہ سب مل جائے گا

اور ہاں، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو۔ میں نے کہا صاحب یہ کیسی بات کہ اوروں کو برس برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو۔ فرمایا کہ تم اب چند روز میں سب روپے اور اجرا کا حکم مل جائیگا اور وں کو یہ بات شاید برسوں میں میسر آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔ آج دو شنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دو پہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیجکر

سو روپے منگالوں۔ پر یاد رہے ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھئے یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ حاکم پنجاب کو گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ دستنبو منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب مجھ سے یہی کہہ کر مانگی اور میں نے دیدی اب دیکھوں کہ حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔ اس وقت تمہارا خط اور یوسف میرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھکر روانہ کیا ہے۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میرن صاحب۔ میر سرفراز حسین۔ میر نصیر الدین کو دعا۔

"غالب"

جوابِ مجروح

قبلہ و کعبہ! آداب بجا لاتا ہوں۔ بھلا حضرت آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کے طرز پر لکھ سکوں تو یہ۔ استغفر اللہ

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

مہرِ عالم افروز کے سامنے ذرۂ ناچیز کی کیا نمود۔ اور بحرِ بیکراں کے روبرو قطرۂ تنگِ فطرت کا کیا وجود۔ یہ دعویٰ میاں ظہوری کریں۔ یہ اندیشہ نظیری کو ہوئے۔ میں بیچارہ کس حساب میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات منبع کمالات کو اس فن میں یکتا پیدا کیا ہے۔ ہاں اگر دو چار برس قدموں میں پڑا رہوں اور فضل و کمال کی طرح دروازے پر حاضر رہوں تو البتہ کچھ راہ پر آجاؤں سو یہ چرخ تفرقہ پرداز کب کسی کو اپنی مراد پر پہنچاتا ہے اور کب چاہتا ہے کہ دو آدمی حسبِ دلخواہ ایک جگہ بیٹھیں۔ کچھ

ان دنوں میں آپ ہی آپ جی گھبراتا ہے اور شوق قدمبوسی اگر حضرت یہی صورت ہے تو دو چار دن میں حاضر ہوتا ہوں یہ ولولہ افگن ہے کہ چل اور خاکِ قدم کو صندلِ پیشانی کر اور اختصاص قدمبوسی پاتا ہوں۔ زیادہ حد آداب

میر مہدی مجروحؔ

غلام غوث بے خبر کے خطوط

مرزا غلام امام شہیدؔ کے نام

قبلہ! میری شوخی دیکھئے، یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لیجاتا ہوں۔ ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نور افشانی کا معمّہ حل کرتا ہوں لعل کے روبرو میں رنگ کی دکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں۔ مسیحا سے کہتا ہوں جاں بخشی کی روایت سنیئے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ یدِ بیضا کی چمک دیکھئے یعنی حضرت کا دیوان مرتّب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے۔ ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو میں مرے! اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارہ سے حظ اٹھائے! گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکّہ بٹھائے! مگر چونکہ غلبۂ شوق میں تمیز باقی نہیں رہتی۔ یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں کیا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ دیباچہ بھی لکھ ڈالا۔ وہ اس کے قابل تو کب ہے کہ ہے۔ آپ کے دیوان پر میرا دیباچہ ایسا ہے جیسے موتی کی لڑی میں سنگریزے کا آویزہ لگا ہو یا زربفت کے قبا میں چھینٹ کا حاشیہ

لگا ہو۔ مانی کی تصویر کے گرد ایک نومشق لکیریں بنا دے۔ سحبان کے کلام کی ایک ابجد خواں شرح لکھا دے۔ مگر اس نظر سے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ بدصورت کے مقابلے میں حسین کے حسن کو اور رونق ہوتی ہے۔ شب تار میں شمع کی روشنی زیادہ ضیا دیتی ہے۔ کھاری پانی پینے کے بعد قند کے شربت میں اور ہی مزا آتا ہے۔ صحرا نوردی کے بعد باغ کی سیر کا لطف کہا نہیں جاتا ہے۔ خاطر مشکل پسند پسند کر لے تو ہو سکتا ہے بیشک دیکھنے والوں کو اس کی خوبی زیادہ دکھائے گی۔ ستارہ دیکھ کے جو چاند دیکھے اسے روشنی زیادہ نظر آئے گی۔ میری خوش طالعی ہے۔ اگر یہ قبول ہو اس کے لئے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اسے حصول ہو۔

"بیخبر"

مولوی محمد حامد کے نام

میں اس خط کے عنوان کو القاب سے خالی رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ القاب مکتوب الیہ کی شان کے موافق لکھا جاتا ہے اور جب ان سے محض لاعلمی ہو تو کیا لکھا جائے اور آپ سے میں استدعا کرتا ہوں کہ آپ اپنی شان کے لائق لکھ لیں۔ اس محبت غائبانہ کا کیا شکر ادا کروں کہ آپ کو میری خیریت کی طرف تعلق خاطر ہے۔ اور آپ نے اس کو مجھ سے دریافت کیا۔ الحمد للہ۔ ہر حال میں خوشحال ہوں اور گوشۂ عافیت میں زندگی کی میعاد پوری کر رہا ہوں۔ قصہ کہانیوں میں سنا کرتا تھا کہ اس قسم کے دوست بھی ہوتے ہیں کہ محبت رکھتے ہیں اور نظر نہیں آتے تو استعجاب ہوتا تھا۔ جب سے یہ معاملہ پیش آیا کہ آپ دل سے تو مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور آنکھوں سے میری چھپے رہتے ہیں تب سے وہ تعجب جاتا رہا۔ اب یہ دعا ہے کہ خالق جن و انس آپ کے دل میں میری

محبت کو اتنا بڑھائے کہ وہ ایک دن کھینچ کر آپ کو میری آنکھوں کے سامنے لائے۔

"نیچر"

سر سیّد احمد خاں کے خطوط

خواجہ الطاف حسین حالی کے نام

جناب مخدوم و مکرم من! عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے کس صفائی، خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات، دور از کار سے جو مایۂ ناز شعراء و شاعری ہے، بالکل مبرّا ہے کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت اشارہ اس نثر میں ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبّت کا اثر سمجھتا ہوں اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بیشک میں اسکا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہدوں گا "حالی" سے لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیئے کہ نمازوں میں اول

خطبوں میں اسی کے بند پڑھیں۔ آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمائیں یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جائے اور رجسٹری کردی جائے میں دل سے شکر کرتا ہوں مگر نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جائے جس قدر چھپے اور جس قدر مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے اور سارنگی پر گائیں، قوال درگاہوں میں گائیں، حال لانے والے اس سچے حالی پر حال لائیں۔ اسی قدر زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا دل تو چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔ میرے ان استفسارات کا جواب جن پر نشان درج کردیا ہے، بہت جلد مرحمت ہو۔

والسلام خاکسار آپ کا احسان مند تابعدار

سید احمد

جناب مشتاق حسین صاحب کے نام

مخدومی و مکرمی نواب انتصار جنگ بہادر

آپ کے استعفیٰ واپس ہونے سے مجھے خوشی ہوئی گو آپ کو نہ ہوئی ہو، مگر میں بہ لحاظ اپنی خوشی کے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ پھوٹ کا میوہ حیدر آباد میں سے پیدا ہونا معدوم ہوجائے۔ اب تین امر ہیں جن کو میں آپ سے

کہنا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ سر آسمان جاہ کے نام کی آسمان منزل کا چندہ جلد تر وصول کرو۔ نہ انسان کو اپنی زندگی پر اعتماد ہے نہ انقلاب زمانہ پر۔ پس ایسے کام کو جو رفاہ عام قومی سے متعلق ہو۔ یوں تساہل و تاخیر میں ڈالے رکھنا نہایت غلطی ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ عناصر اربعہ نے جو متفق ہو کر تدبیر کی تھی کہ جو نقصان بسبب انسداد امداد راجہ امیر حسن خاں پہنچا ہے اس کا معاوضہ ادا کیا جاوے۔ وہ کیا تدبیر تھی اور کیا اس کا نتیجہ ہوا اور کیا اس سے توقع رکھنی چاہیئے۔

تیسرا امر یہ ہے کہ (عَسٰی ان تکرھُوا شَیْئاً وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئاً وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ) جو کہ میرے نزدیک تمہارا استعفیٰ نامنظور ہونا اس آیت کے حصہ اول میں داخل ہے۔ اس لئے تم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور شکر ادا کرنے کی صورت مناسب یہ ہے کہ محمد بن سعید کاتب الواقدی کی ایک کتاب اسلامی تاریخ کی ہے اور غالباً بڑی کتاب ہے۔ نایاب ہے۔ جرمنی میں اس کا ایک باب ترجمہ ہو کر مع اصل عربی کے چھپا ہوا ہے اس باب کا عنوان یہ ہے۔ "ذکر بعثتِ رسول اللہ الرسل بکتابہ" اس میں آنحضرت کے نامے منقول ہیں۔ مع حالاتِ ایلچیان وغیرہ۔ اسی میں تمام وفود کا جو قوموں کے پاس گئے اور قبائل اور قومیں ایمان لائیں بغیر جنگ وجدال کے مندرج ہیں۔ اس باب کے آٹھ صفحے ہیں پتھر کے چھاپے میں ۱۵ سے زیادہ نہیں ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس باب کو دینیات کے درس میں داخل کردوں۔ عربی لینگ ویج میں اصل عربی اور فارسی لینگ ویج میں اس کا ترجمہ فارسی۔ عربی اصل کے چھاپنے میں ایک سو پچاس روپے خرچ ہوں گے مگر چونکہ عربی زبان کی کتاب کم تر فروخت ہو گی۔ صرف طالب علم یا

دس پانچ آدمی خریدیں گے۔ اس لئے اس کی لاگت وصول ہونی محال ہے۔ پس آپ بشکر اللہ اس کتاب کو چھپوا کر یا تو خاص طالبعلموں کے لئے وقف کر دیجئے۔ یا کالج کو دیدیجئے کہ وہ بہ قیمت فروخت کرے۔ فارسی ترجمہ اس کا یا تو میں خود چھپواؤں گا یا کالج کی طرف سے چھپواؤں گا۔ کیونکہ اس میں نقصان ہونے کا مطلق احتمال نہیں ہے بلکہ فائدہ ہوگا۔ اوّل تو فارسی پڑھنے والے طالب علم زیادہ ہیں دوسرے اس کے خریدار بھی زیادہ ہوں گے۔ والسلام

خاکسار سیّد احمد

ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط

اپنے اکلوتے بیٹے بشیر الدّین احمد کے نام

بشیر! بچپن میں تمہارا زیادہ وقت خدمت گاروں میں بسر ہوتا تھا۔ چونکہ یہ لوگ تم کو کھلاتے بہلاتے تھے۔ ایک دن میں نے تم سے کہا۔ میاں بشیر! تم نوکروں میں رہ کر اگر گالیاں بکنی یا قسم کھانی یا جھوٹ بولنا سیکھ گئے تو بھی تمہارا منہ سڑ جائے گا۔ اور میں تم کو اپنے ساتھ نہیں سلاؤں گا بچے معصوم! تم کو میرے کہنے کا یقین ہو گیا ایک دن تمہاری زبان سے کوئی بیہودہ بات نکلی اور فوراً تم کو میرا مقولہ یاد آیا تو بھاگے ہوئے اپنی والدہ کے پاس گئے کہ "اماں بی! ذرا منہ سونگھنا" ان کو میری نصیحت کا حال معلوم تھا۔ سمجھ گئیں اور بولیں: "سونگھ کر کیا کروں گی۔ گالیوں کی بو آرہی ہے" یہ سن کر بہت گھبرائے۔ آخر کار انھوں نے توبہ کرا دی اور الائچی کے دانے چبوا لئے۔ تب تم کو تسلّی ہوئی۔ مگر بہت دنوں تک تم اس بدبو کے ڈر سے احتیاط کرتے رہے اور

شکر ہے کہ تمہاری زبان گالی سے آشنا نہیں ہوئی۔

نذیر احمد

ایضاً

اسی وقت تمہارا خط مقام سکندر پور خاص میں پہنچا۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی تمہارا دل نہیں لگتا ہوگا۔ اور فی الواقع مدرسے کے انتظام کو کوئی شائق آدمی کبھی پسند نہیں کر سکتا لیکن میں نے تم سے بار بار کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ تم مدرسے میں صرف اتنے واسطے داخل ہوئے ہو کہ انگریزی زبان میں ترقی کرو۔ اگر تم مدرسے کی پڑھائی پر بس کروگے تو بالکل وقت ضائع جائے گا۔ تم باہر اپنا انتظام کر لو۔ اپنے سے بہتر ماسٹر ہو یا طالب علم اس سے مدد لو۔ برخوردار اب تم کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں بہت تھوڑے آدمی ہیں جن کو تم اپنا دلی خیرخواہ کہہ سکو۔ جو بے انتظامی دہلی کالج میں ہے۔ وہی لوٹ دیسی ہی دنیا کے سب کالجوں میں ہے اور میں جانتا ہوں کہ علی گڑھ کالج بھی اس سے صاف نہیں ہوگا۔ پڑھائی کم تعطیلیں زیادہ۔ استاد نامہربان۔ ہم سبق شیطان۔ تم نے مجھکو ابھی تک اطلاع نہیں کی تم نے کس سے جدید اور مفید تعارف پیدا کیا اور اپنے رات دن کے اوقات کا کیا انتظام قرار دیا۔ باہر کی تحصیل جاری کرو کہ تمہارا دل لگے ایک دن کا بیکار رہنا طالب علم کے حق میں زہر ہے۔ پھر دل ایسا کچھ اُچاٹ ہو جاتا ہے کہ مہینوں طبیعت قابو میں نہیں آتی سیر بازار اور تماشائے عجائب خانہ وغیرہ کو اپنے اوپر قطعی حرام کرو ورنہ تم کو آخر کار بہت افسوس کرنا پڑے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس خط کے پہنچنے تک تمہارا صندوق بھی پہنچ جائے گا اور جب تمہارا سب سامان درست ہو جائے گا اور باہر کے سبق مقرر کرلوگے اور وقت بنٹ جائے گا تو کوئی وجہ گھبرانے کی نہ ہوگی۔ میں جائز نہیں رکھتا کہ تم پرنس آف ویلز کے دیکھنے کو لوگوں کے ہجوم

میں گھُسو۔ ہم غریب آدمیوں کو شاہزادوں سے کیا نسبت اور ہمیشہ دیکھا ہے کہ لوگ دور سے دیکھکر اکثر کسی مصاحب کو شاہزادہ فرض کرکے خوش ہو لیتے ہیں اور بالفرض اگر واقعی شاہزادے کو کبھی دیکھا تو اس سے فائدہ!

میرا حال یہ ہے کہ ایک لمحہ طبیعت نہیں لگتی۔ لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اکیلا اداس بیٹھا رہتا ہوں اور حیرت میں ہوں کہ اس طرح کی زندگی کیونکر اور کب تک بسر ہو گی خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو یعنی جس غرض سے میں نے اس مصیبت کو اپنے اوپر گوارا کیا ہے اس مطلب کو فوت مت کرو۔ پڑھو اور محنت کرو اور دنیا میں نام و نمود پیدا کرو۔

نذیر احمد ۱۱ر جنوری ۱۸۷۶ء سہ شنبہ

محمد حسین آزاد کے خطوط

شاگرد رشید لالہ دنی چند وکیل کے نام

عزیز من! میرے دل پر یقین ہے کہ تمھارے دل پر کیسے اضطراب گذر رہے ہوں گے۔ مگر یہ بھی خیال ہے کہ تم کہتے ہو گے کہ محمد حسین کو کیا غرض ہے جو خیال رکھا ہو گا۔

میرا یہ حال ہے کہ باوجود کثرت پریشانی اور شدت جنوں کے ایک لحظہ اس تلاش و کوشش سے خالی نہیں۔ مگر کوئی بات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت تک قابل اطلاع نہ تھی اس وقت یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ تمھاری ذیل کے تھے سب کے باب میں منظور و نامنظور جو ہونا تھا ہو گیا مگر تمھارے باب میں کچھ معلوم نہیں۔

مجبوراً ایک عرضی اور خدمت میں صاحب رجسٹرار یونیورسٹی کے تمھاری

طرف سے لکھ کر دی ہے کہ آپ پھر اس باب میں رجسٹرار چیف کورٹ کو لکھیں تاکہ کچھ حال تو معلوم ہو۔ اسی قدر چاہیئے تھا۔ دہی تم کو لکھدیا اور اس میں یہ بھی مطلب ہے کہ تمھیں معلوم رہے کہ تمھاری طرف سے میں نے عرضی دی ہے۔ یعنی تمہاری طرف سے مجھے اجازت ہی کہ مناسب حال تحریر کرتا رہوں اور میری کوئی تحریر اس معاملے میں بمنزلہ تمھاری تحریر کے ہی۔ فقط

محمد حسین عفی عنہ ۶ر دسمبر ۱۸۷۸ء

منشی ذکار اللہ صاحب کے نام

منشی میاں! کل صبح کو میں بموجب معمول کے ہوا کھانے نکلا۔ شہر کے باہر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مرد مقدس، متقی وضع، پرہیز گار صورت، جبہ پہنے حاجیان عرب کا عمامہ سر پہ، ہزار دانہ کی تسبیح ہاتھ میں، آہستہ آہستہ سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے چہرے کو سفید ڈاڑھی کے نور نے روشن کیا تھا۔ جبہ کے سبز رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت خضر ہیں مگر عصا کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ ہیں چونکہ بزرگوں کا ادب میری طبیعت میں خداداد ہے۔ میں نے انھیں سلام کیا انھوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے میرا سلام لیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی باوقار آنکھوں سے جو نگاہیں نکلتی ہیں ان سے محبت و شفقت ٹپکتی ہے بے اختیار میں بڑھا اور مصافحہ کرکے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ چونکہ صبح کے وقت انوار الٰہی کا جلوہ پھیلا ہوا تھا، دوسرے ان کی صورت اور لباس نے دل پر اثر کیا۔ اپنی بداعمالی اور دنیا کی سیہ کاری کا خیال کرکے ان سے عرض کی کہ مجھ روسیاہ کو نصیحت فرمادیں جو میرے کام آئے۔

مسکرائے اور اس طرح میری طرف دیکھا کہ میرے دل اور جان کو اپنا معتقد بنالیا

پھر مجھ سے کہا کہ "ہم تمہارے حسنِ عقیدت سے بہت خوش ہوئے" وہ آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے اور میں نصف قدم ان سے پیچھے گھسٹتا چلا جاتا تھا۔ چند لمحے میں نے تامل کیا کیوں کہ ان کی متانت اور وقار مجھے زیادہ بولنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آخر پھر ہمت باندھ کر سوال کی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا انھوں نے فرمایا کہ قلم دوات تمہارے پاس ہے۔ عرض کی کہ نہیں مگر جو کچھ آپ فرمائیں گے بندہ صفحۂ دل پر نقش کرتا جائے گا۔ پھر مسکرائے اور فرمایا کہ اہلِ دنیا بے وقوف نا اہل ہیں۔ ہم نہ کسی کو اپنا دیدار دیتے ہیں اور نہ کسی سے بات کرتے ہیں مگر اس وقت یہ حسنِ عقیدت تمہارا ہمیں پسند آیا اس لئے چند فقرے جن میں بہت سی کتابوں کا بلکہ ہزاروں کتب خانوں کا عطر کھینچا ہوا ہے تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ انہیں نا اہلوں سے بچانا اور اپنا دستور العمل بنانا کہ یہ ہمارے اسرار ہیں۔ میں نے پھر جھک کر سلام کیا اور آنکھیں بند کر کے اشارہ کیا یعنی بسر و چشم منظور۔ انھوں نے کہا کہ :۔

(۱) یاد رکھو کہ دنیا میں دوست تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جو زیادہ دوستی برتے اسی کو دشمن سمجھو۔

(۲) دشمن سے ایسی دلفریب محبت برتو کہ دوستوں کی دوستی نابود ہو جائے۔ آدمی ہو تو الو بن جائے۔ پھر اگر سلیقہ ہو تو پنجرے میں بند کر کے پر تیغ کر دو نہیں تو ... مطلب نکالو اور چھوڑ دو۔

(۳) محبت کو نیکوں کی نیکی پر منحصر نہ رکھو نہ اسے ان کی نیکی کی مقدار پر خرچ کرو۔ تم اپنا مطلب دیکھتے رہو جس سے نکلتا ہو اُس کو گدھا بناؤ اور جھٹ سوار ہو جاؤ۔

(۴) اس میں پہلے یہ اعتقاد رکھو کہ دنیا میں اچھا تو کوئی بھی نہیں یہ ہم صورت

جو آدمیوں کے جامہ میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تو گدھے ہیں۔ ہاں ان پر سواری کرنے والے البتہ تھوڑے ہیں۔

آزاد

حضرت داغ دہلوی کا خط

حکیم قمر الدین کے نام

عمر کے دن گزرتے جاتے ہیں جیتے جی ہم تو مرتے جاتے ہیں

حکیم صاحب مسیحائے زماں سلمہ الرحمن! سلام مسنون کے بعد مدعا نگار ہوں۔ آپ کا کارڈ پہنچا۔ آپ کی عبارت مقفیٰ کس قدر بلیغ ہے۔ آپ نے میرے انتقال کی جو خبر سنی میں بھی اس کو سچ سمجھتا ہوں ؎

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں
زندگی کا کوئی حساب نہیں

آپ نے ایک مرتبہ میرے مرنے کی خبر سنی۔ میں ہر سال سنتا ہوں اور اس کو اپنی سالگرہ سمجھتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ جن رئیس نے میرے زندہ ہونے کی تصدیق کی تھی وہ چل بسے۔ خدا ان کو جنت نصیب کرے اور مجھے اور آپ کو بھی۔ میں آپ کا ممنون ہوا کہ آپ نے اس دل سوزی سے داغ کو یاد فرمایا

عمرت دراز باز کہ ایں ہم غنیمت است

داغ دہلوی

مولانا حالی کے خطوط
ڈاکٹر عبدالحق کے نام

مکرمی و شفیقی اسلمہ اللہ تعالیٰ

آپ کا کارڈ اور خط دونوں پہنچے۔ خدا کا شکر ہے کہ کانپور سے کتابیں پہنچ گئیں امید ہے کہ کلکتہ سے درجہ اوّل کی کتابیں بھی عنقریب پہنچیں گی۔ جس وقت وہاں سے کتابیں آجائیں ایک کارڈ اطلاعی ازراہ عنایت بھیج دیجئے گا۔ امید ہے کہ آپ کی طبیعت اب اعتدال پر آگئی ہوگی۔ مگر قولنج کا مرض جو دورانِ حال آپ کو لاحق ہوا تھا، یہ ایک ایسا مرض ہے کہ اس سے افاقہ ہونے کے بعد بھی غافل نہ رہنا چاہیئے اور ایسی تدابیریں کرنی چاہئیں اور کھانے پینے میں ایسی احتیاط کرنی چاہیئے کہ اس کی بیخ کنی ہوجائے اور پھر اس کا دورہ نہ پڑے۔ غالباً میرن صاحب حیدرآباد سے روانہ ہوگئے ہوں گے۔ ان کو مولوی سید علی حسین صاحب کے چلے آنے سے سخت صدمہ پہنچا اور ظاہراً حیدرآباد میں ان کا آخری پھیرا ہے۔ آپ مہربانی کرکے ایک ایک جلد درجہ دوم کی مولانا شبلی اور مرزا عزیز الحق صاحب کی نذر کردیجئے گا۔ نواب عماد الملک بہادر کو علیحدہ کتاب دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ سررشتہ تعلیمات میں جس قدر کتابیں بھجائیں گی۔ وہ سب ان کے قبضے میں ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو، اس کتاب کی تیاری میں اس قدر روپیہ صرف ہوگیا ہے کہ اگر کل کتابیں فروخت ہوجائیں تو بھی امید نہیں کہ اصل لاگت وصول ہو مگر میں خوش ہوں کہ ایک بہت بڑے فرض سے، جو تمام قوم کے ذمہ تھا کس قدر سبکدوشی ہوگئی ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ مولوی سید علی حسین صاحب کی

معرفت نواب مدار المہام کی خدمت میں ایک نسخہ بطریق نذر پیش کیا جاتا اور یہ درخواست کی جاتی کہ اس کی کچھ زائد جلدیں معمولی تعداد کے علاوہ سرکارِ عالی میں خرید کی جائیں سو وہ موقع تو اب ہاتھ سے جاتا رہا۔ میں ہرگز یہ خیال نہیں کرتا کہ میں نے اس عجیب و غریب شخص کی بائیو گرافی لکھنے کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے بلکہ مجھے اپنی کمزوریاں اور لغزشیں بخوبی معلوم ہیں اور میں علی الاعلان اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے اس بائیو گرافی کا حق ادا نہیں ہو سکا لیکن میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ کسی متنفس نے قلم سے یا درم سے براہ راست اس کام میں مجھے مدد نہیں دی۔ (الا ماشاء اللہ) پس اگرچہ یہ کام فی نفسہ کچھ قدر کے لائق نہ ہو، مگر اس لحاظ سے کہ میں نے اس کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہے، ضرور توجہ کے لائق ہے ؎

اگر بریاں کند بہرام گورے
نہ چوں پائے ملخ باشد ز مورے

میں اس موقع پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جب میں نے مسدس مد و جزر اسلام کا پہلا ایڈیشن نکالا اور اس کی ایک جلد سر سید مرحوم کے پاس بھیجی تو بغیر اس کے کہ میں نے اس مرحوم سے کوئی درخواست کی ہو فوراً مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں میں نے جواب لکھ بھیجا، انھوں نے اسی وقت ایک فہرست اپنے احباب کی مجھے لکھ کر بھیجی کہ اتنی جلدیں فلاں دوست اور اتنی فلاں کو اتنی وہاں اور اتنی وہاں بھیجدو اور اپنے دوستوں کو لکھ بھیجا کہ کتابیں پہنچتے ہی قیمت مصنف کے پاس بھیجدیجیے۔ چنانچہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں جس قدر جلدیں چھپوائی تھیں۔ سب فروخت ہو گئیں اور دوسرا ایڈیشن چھپوانے

کی ضرورت ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ خیالات وہ شخص اپنے ساتھ لے گیا اب ان کے بڑے بڑے ذی مقدور دوست اس بات کے متوقع ہیں کہ ان کی جناب میں کتاب مفت نذر کیجائیں جسے قیمت بہت گراں بتاتے ہیں اور یہ تو کسی سے بھی امید نہیں کہ مصنف کی محنت کی کچھ داد دی جائے یا کچھ قدر کی جائے۔

سوختیم و سوزشِ ما بر کسے ظاہر نہ شد
چوں چراغانِ شبِ مہتاب بیجا سوختیم

خاکسار الطاف حسین حالیؔ

مولانا ظفر علی کے نام

عزیزی!

اس وقت حسن اتفاق سے تھوڑی دیر کے لئے مکروہاتِ خانگی سے نجات ملی تھی جنوری کا دکن ریویو سامنے رکھا ہوا تھا جس کو تفصیلی نظر سے اب تک نہ دیکھا تھا۔ سرسری پر آپ کی نظم جو "رود موسیٰ" پر لکھی گئی تھی نظر پڑی اوّل سے آخر تک بہت غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی میرا حال اب یہ ہو گیا ہے کہ پرانی طرز کی نظمیں تو (الاماشاء اللہ) اس لئے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ان میں کوئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئی طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیئے اور جس کو جادو کے سوا اور کسی لفظ کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جاسکتا کہیں نظر نہیں آتی — لیکن اس نظم کو دیکھکر میں متحیر ہو گیا۔ مرثیہ دیکھکر بھی مجھے ایسا ہی تحیر ہوا تھا لیکن اس وقت آپ کے دل کو لگی ہوئی تھی اور ایسا کلام جو دل کے جوش پر مبنی ہوتا ہے خواہی نخواہی موثر اور دلکش ہوتا ہے لیکن رود موسیٰ پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے یہ محض زورِ طبع اور شاعری کی خداداد قابلیت سے

سے لکھا ہے اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر بھی کچھ طبع آزمائی کرتا مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھ والے بھی اب ہماری طرح پا در رکاب ہیں صرف پنجاب میں آپ جیسے لوگوں کی صورتیں نظر آتی ہیں بشرطیکہ آپ کو بھی فکر معاش دم لینے دے اور یہ چٹیک بھی دل کو لگی رہے امید ہے کہ آپ بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے

والسلام خیر ختام خاکسار الطاف حسین حالی

خواجہ تصدّق حسین کے نام

برخوردار سعادت آثار طال عمرہٗ - بعد دعا کے مدعا یہ ہے پرسوں ٹیلیگرام اور کل تمہارے دونوں کارڈ پہنچے۔ جن سے تمہاری تقرری عہدہ اکسٹرا اسسٹنٹی پر معلوم ہوئی خدائے تعالیٰ کا بے انتہا شکر ادا کیا گیا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے تمہاری مردانہ اور ذی استقلال کوششوں کا پھل تم کو عنایت فرمایا اور ہمارے غریب خاندان کو تمہارے سبب سے تقویت بخشی ——— جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمہاری سعادت مندی اور کسی قدر تمہاری نادانی کی دلیل ہیں۔ اگر بفرض محال میری کوشش کو تمہاری کامیابی میں کچھ دخل ہو بھی تو اس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہیئے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تعجب کی وہ باتیں ہیں جو آجکل دنیا میں لوگ کر رہے ہیں۔ غیروں کے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں۔ اپنی بساط سے زیادہ ان کی امداد کرتے ہیں۔ تمام قوم کے لئے ویسی ہی کوشش کرتے ہیں جیسی کسی خاندان کا سرپرست اپنے خاندان کے لئے کرتا ہے۔ اپنی جان اور

مال اور وقت اور دل و دماغ کو قوم کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ قوم کی طرف سے اُن پر گالیاں پڑتی ہیں مگر وہ قوم کا خیال نہیں چھوڑتے اور رات دن اسی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن کا ہم کو اور تم کو اور تمام قوم کو دل و جان سے شکر ادا کرنا چاہیئے اور انہی کا صدقہ ہے کہ ہماری قوم میں کسی قدر آپس کی ہمدردی کا خیال پیدا ہوا ہے۔ بہرحال اگر میں فی الواقع ان باتوں کا مستحق ہوں جو تم میری طرف نسبت کرتے ہو تو مجھ کو بلا شبہ فخر کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ تم کو ترقیاتِ روز افزوں نصیب کرے اور عزت و آبرو کے ساتھ ہمیشہ اپنے مقاصد میں کامیاب کرتا رہے۔ اور خدا کرے کہ پانی پت کے شریف زادوں کو تمہاری ریس کرنے کا خیال پیدا ہو۔ آمین ثم آمین منشی سراج الدین بالفعل حیدرآباد میں ہیں اور معلوم نہیں کہاں ٹھہر رہے ہیں۔ اسلئے ان کو خط نہیں بھیجا جاسکتا۔ میرے نزدیک برخوردار محب علی طال عمرہٗ کو جلدی کرنی نہیں چاہیئے۔ خدا نے یہ دن دکھایا ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری ہی کوشش سے انکے لئے کوئی صورت نکل آئے گی اور کسی غیر شخص سے التجا نہ کرنی پڑے گی۔ تمہاری والدہ صاحبہ اور والد ماجد بہت بہت دعا اور مبارکباد کہتے ہیں اور والدہ صاحبہ کی یہ خواہش ہے کہ پہلی تنخواہ میں سے سو روپیہ اپنے خرچ کے واسطے رکھ کر ڈیڑھ سو روپیہ یہاں بھیجدو تو دہانیوں کو بھی جو مدت سے آس لگائے بیٹھی ہیں دیا جائے اور مصلی اور مجلس اور منتیں جو مان رکھی ہیں سب پوری کی جائیں اور جو کچھ بچے وہ ہمارے ماہواری خرچ میں آئے۔ تمہاری چچی اور بھاوج اور برخورداری مبارکباد کہتی ہیں۔ کل برخوردار سجاد حسین کے خط سے معلوم ہوا کہ یکم دسمبر سے صاحب ڈائرکٹر نے اُن کو ایک سو چالیس کے درجہ میں مقرر کر دیا ہے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ برخوردار محب علی طال العمرہٗ کو بہت بہت دعا کہنا اور مبارکباد دینا۔ زیادہ دعا

راقم الطاف حسین از پانی پت ۲۹ جنوری ۱۸۹۳ء

شبلی نعمانی کے خطوط

پدر بزرگوار شیخ حبیب اللہ صاحب کے نام

قبلہ ام! تسلیم

گو میرا قلم خامۂ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب و غریب مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں تاہم مجھکو یہ امید نہیں کہ اس کوشش سے عزیزانِ وطن کو جو میرے خط پر آنکھ لگائے بیٹھے ہوں گے اپنے شوق و انتظار کا صلہ مل جائے گا۔ میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ نینی تال ایک عجیب اور حیرت انگیز مقام ہے لیکن اگر "تعجب انگیز" اور "دلچسپ" "فرحت افزا ہونا" دو جداگانہ چیزیں ہیں تو مجھ ایسے ایشیائی خیال آدمی سے یہ اُمید رکھنا عبث ہے کہ میں اس کو "فرحت زا" بھی مان لونگا۔ ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں ان کا مذہب کیا پوچھنا ہے ہر چہ آید در دلم غیر تو نیست۔

اب حالات سنئے۔

کارٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہے اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ کارٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے مگر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی و عظمت کا مرقع ہے۔ عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے۔ دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت

سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دار السلطنت ہوتے نینی تال جب تین میل رہ جاتا ہے تو پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے سطح زمین سے اس مقام کا ارتفاع تین میل سے کم نہیں مگر اس کج ویچ سے راہ نکالی ہے کہ بے اختیار انگریزوں کی ہمت پر آفریں کی صدا بلند ہوتی ہے۔ آپ خود خیال کرسکتے ہیں کہ جو کوٹھا تین میل کا اونچا ہوگا اس کے زینے کیسے پیچ دار اور دشوار گذار ہوں گے۔ کوئی شخص کیسا ہی بے حس یا مستقل دل رکھتا ہو یہاں پہونچکر ممکن نہیں کہ حیرت کے صدمہ سے بچ سکے تال جو ایک میل سے زیادہ لمبا ہے یہ ایک نہایت گہرا غار ہے، جس کی تھاہ اب بھی غیر معلوم ہے اس میں مدت سے قدرتی چشموں کا پانی گرتا ہے اور اب وہ بھر گیا ہے اور تال کے لقب سے ممتاز ہے۔ شام کو اس کے کنارے میموں اور مسوں کا مجمع ہوتا ہے اور مختلف طرح کے کھیل کھیلتی ہیں۔ سامنے ایک میدان ہے جس میں انگریز کرکٹ کھیلتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر چونکہ اس کے دونوں طرف پہاڑ کی نہایت اونچی دیواریں کھڑی ہیں۔ مجھکو یہ جگہ ہر طرف سے نہایت بند اور گھٹی ہوئی معلوم ہوئی۔ مجھکو یقین ہے کہ جو شخص صحرائیت اور فضائیت کا دلدادہ ہے میرے دعوے کی شہادت پر فوراً آمادہ ہوگا جس کوٹھی میں میں ہوں۔ بہت بلندی پر نہیں ہے تاہم دو دن کی مشق میں نیچے تک پہونچنے اور واپس آنے میں میرا دم ٹوٹ جاتا ہے اور کئی جگہ ٹھہرنا پڑتا ہے ہر ایک کوٹھی سے انگریزوں کی بے روک ہمت اور پُر جوش محنت کی شہادت ملتی ہے۔ یہاں جو کچھ آرام ہے۔ صرف یہ ہے کہ کسی وقت یہاں آفتاب کی عملداری نہیں ہونے پاتی یہی بات ہے جس کے لئے انگریزوں نے لاکھوں کروڑوں روپے صرف کردیتے ہیں۔ درحقیقت ہم کو انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہیئے کہ صحت سب چیزوں پر مقدم ہے اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں۔ رمضان تو

خوب گذرے گا۔ مجھکو اگر کچھ دلچسپی ہے تو اسی سے۔ جس کوٹھی میں ہوں۔ سید صاحب کے حقیقی بھتیجے بھی مع اہل و عیال کے تشریف فرما ہیں اور مجھکو بھی مشکل سے جگہ ملی یقیناً اگر میاں محمد آتے تو نہایت تکلیف اور سید صاحب پر بار ہوتا۔ تحریر فرمایئے کہ مدرسے کے لئے کیا ہوا۔ منشی جی نے رقعہ لکھایا نہیں۔ میرا خط محمد سمیع کو عنایت ہوتا کہ تمام لوگ یہاں کے حالات سے مطلع ہو سکیں۔ میرا پتہ یہ ہے۔ نینی تال کوٹھی نمبر ۱۶ ایڈ ولیسٹوا یارپاٹا فدوگاہ سید احمد خاں۔

شبلی نعمانی ۲۵ مئی ۱۸۸۶ء

سر سید احمد خاں کے نام

یہ تیسرا خط ہے جو استنبول سے لکھ رہا ہوں آپ کو اور بزرگان وطن کو میرے خطوط کا انتظار نہ کرنا چاہیئے یعنی سکوت کی حالت میں قیاس بلکہ یقین کر لیجئے کہ میں بخیریت ہوں۔ باقی رہے حالات سفر اس کی نسبت میں لکھ چکا ہوں کہ یہاں سے کچھ نہ لکھوں گا۔

قلمی کتابیں یہاں نہیں ملیں، مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آجاتی ہیں، اس لئے صرف مطبوعہ کتابیں خریدی جا سکتی ہیں لیکن ان کی تعداد بھی معتد بہ ہے، یہاں امام غزالی کی تمام کتابیں اور رسالے موجود ہیں۔ مکاتیبات کا نسخہ بھی ہے بو علی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں کہ کہیں نہ ہوں گی ارسطو وغیرہ کے کتابوں کے اصلی ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں لیکن کیا حاصل؟ کتابت کی شرح ۴ روپیہ جز سے کسی حال میں کم نہیں معتزلہ کی کتابیں البتہ ناپید ہیں، عبد القادر جرجانی کی تفسیر ہے مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں

پرسوں میں عثمان پاشا سے ملا۔ نہایت اخلاق سے ملے۔ عربی سمجھ لیتے ہیں اور دو چار معمولی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھ کا بوسہ دینا چاہا۔ لیکن راضی نہ ہوتے

بلکہ الٹی خود میری تقلید کرنی چاہی۔ رخصت کے وقت آپنے فرمایا کہ آپ جب چاہیں تشریف لائیں، بہت خوشی سے ملوں گا۔ تمام اور بڑے بڑے پاشاؤں سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے لیکن اول تو زبان کی اجنبیت ثانیاً مجھکو اور کسی سے ملاقات کا شوق بھی نہیں

یہاں کا ٹائپ بے انتہا عمدہ ہے تمام دنیا میں اس کا نظیر نہیں علی گڑھ گزٹ کے لئے یا مستقل مطبع کے لئے ضرور خرید نا چاہیئے۔ بیروت و ہالینڈ کے حروف میں بھی یہ نوک پلک نہیں افسوس ہے کہ عربی کا پیمانہ بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اس میں ادب کا ذرا پر تو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کی حدود جدا رکھی گئی ہیں۔ اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصلی ترقی نہ ہو سکے گی یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے۔ میں نے کالج کا نتیجہ الکمل الاخبار میں دیکھا اور بے انتہا خوش ہوا بلکہ سچ یہ ہے کہ اسی عالم میں خط لکھنے بیٹھ گیا ورنہ معمولی باتیں روز روز کیا لکھوں۔

روپے فوراً جس قدر کتاب کے لئے بھیجنے ہوں بھیجئے۔ یہاں سے میں اٹھا تو پھر مجھکو خط وغیرہ کوئی چیز نہیں مل سکے گی۔ یہاں کی جو چیزیں مشہور ہیں وہ آپ کو معلوم ہے۔ اگر کوئی چیز مطلوب ہو تو تحریر فرمایئے کہ میں لیتا آؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ کالج کے لئے چند ترکی زبان کی عمدہ کتابیں خریدی جائیں جن سے یہاں کی علمی ترقی کا اندازہ ہو سکے یہ خط ذاکر کے پاس بھیجدیا جائے میاں حمید کو تاکید فرمایئے کہ مجھکو مفصل خط لکھیں اور عزیزوں کے امتحانات کے نتیجے بھی لکھیں۔

میری تصنیفات تیار ہو جائیں تو چند نسخے یہاں کے لئے چاہئیں۔ لیکن دیر ہوگی تو مجھکو نہ مل سکیں گی میں انشاء اللہ اواگست تک یہاں رہوں گا۔

ہاں آج میں حسین حبیب آفندی سے جو بمبئی میں سفیر تھے اور اب یہاں پولیس

جنرل ہیں ملا بے انتہا مہربانی کی، گھر کے تمام کمرے دکھلائے، دعوت کی، اور بہت سی مہربانیاں کیں۔ وہ اردو بخوبی بولتے ہیں۔ آپ فوراً سیرۃ النعمان کا نسخہ جو وہاں میں دیکھ آیا ہوں اور اس پر کالج کی مہر نہیں ہے بھیجدیجئے۔ ضرور میں ان کو ہدایتاً دوں گا وہ اسی مذاق کے آدمی ہیں۔

والسلام: شبلی (قسطنطنیہ)

اکبر الہ آبادی کے خطوط

مرزا محمد ہادی عزیزؔ کے نام

مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ!

مدت سے آپ کی خیر و عافیت نہیں سنی۔ معلوم نہیں مجموعہ مناقب کی اشاعت ہوئی یا نہیں۔ افسوس ہے کہ انتشارِ طبیعت کے سبب سے میں اس کی نسبت کچھ نہ کہہ سکا۔ اگر کبھی ملنا ہوتا تو آپ سنتے کہ کیا اسباب انتشار طبع کے پیش ہیں۔ زندگی اور لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو جاتا ہوں ورنہ خیال تو یہ ہے ؎

خودکشی کی ہم تمہیں دیتے نہیں اکبر صلاح
لیکن اپنی زندگی دنیا پہ کیوں ظاہر کرو

اسی زمین میں ایک اور شعر قابلِ غور ہے ؎

قابلِ دریافت رازِ ہستی پروانہ ہے
کیوں اسے یہ حکمِ فطرت ہے جلو تڑپو مرو!

ہاشم سلمہٗ اصرار کر کے بمبئی دیکھنے گئے تھے۔ میں بہ سبب گرمی اور اپنی ناتوانی کے نہ جا سکا

لیکن ان کا انتظام اور ان سے مراسلت قائم رکھنے کے لئے الہ آباد میں قیام ضروری تھا ہاشم چوتھے روز بمبئی میں بیمار ہو گئے۔ یہ دانشمندی کی کہ فوراً واپس آ گئے تپ میں بیہوش پہونچے۔ اس وقت سخت چیچک میں مبتلا ہیں۔ غافل پڑے ہیں۔ اللہ شفا دے۔

میں تو اخبار زیادہ نہیں دیکھتا۔ پانیر پر نظر پڑ جاتی ہے۔ اخبار دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ طوفان بدتمیزی روز افزوں ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم خود خلاف موسم ہوتے جاتے ہیں۔ میرا ایک مطلع نو تصنیف ہے۔ خدا خیر کرے آپ اتنا ہیں کہ اس کی داد دے سکیں ؎

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

اس وقت آپکا یہ مقطع دیکھکر ؎

یاد پھر آئی کوئی صحبت دیرینہ عزیزؔ
مجلس وعظ میں اب آپ کو کم دیکھتے ہیں

آپ کی یاد آ گئی اور یہ نیاز نامہ لکھا گیا۔ اپنی خیریت تحریر فرمائیے۔ زندگی ہے تو ستمبر، اکتوبر میں موقع ملنے کا ملے گا۔ نیازمند

اکبر حسین

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام

عزیزی مکرّم سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ کے اشعار نے جن کے معنی بحر حقیقت میں ڈوبے ہیں۔ مجھ کو آپ کا زیادہ مشتاق کر دیا۔ زندگی ہے جس کا میں شائق نہیں ہوں تو کبھی ملنا ہو گا اور میں

ہے کہ ہولی میں میں الہ آباد میں نہ ہوں گا۔ پریادان ضلع پرتابگڈھ میں ہوں گا جہاں عشرت سلمہٗ کی سسرال ہے۔ آپ کب تک اعظم گڑھ میں رہیں گے۔ جواب یہیں کے پتہ سے لکھیے گا۔

نیازمند
اکبر حسین

مولانا محمد علیؒ کا خط

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

مکرمی۔ السلام علیکم

آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں اس وقت زلف، وابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا رامپور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ۔ امیر۔ تسلیم عروج۔ دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز، استاد داغ کے شاگرد ہوئے۔ جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار علی خاں روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا۔ وہ مجھے بھی لے جاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا کہو

کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیئے تھے جنہیں میں نہایت شان اور زور سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیئے۔ سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا! اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا نہ ہوگا مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے سنیئے میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں، اس کو ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی و گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔ میری پیدائش سنہ ۱۸۹۹ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس کی ہی عمر میں بہت لغو و فضول شعر مگر با معنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب وہ کسی کو یاد نہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ وہ مشاعرہ جسے بعدہٗ حسرت موہانی نے رونق بخشی۔ ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو پیش ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا Lawn جائے مشاعرہ تھا۔ یک چودھویں کو بارش ہو گئی۔ تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر .... Dining Hall میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطفِ مشاعرہ تو گیا چودھویں کیتھا

محمدؐ علی



مولانا محمد علی مرحوم

ولادت: ۱۸۷۸ء — وفات ۱۹۳۱ء

اسلام کے بہادر سپاہی اور آزادی ہند کے علم بردار، جنہوں نے اپنی پوری زندگی اسلام کے وقار اور مسلمانوں کی آزادی کے لئے وقف کردی تھی۔

برج نرائن چکبست کا خط

لالہ سری رام مصنف خمخانۂ جاوید کے نام

جناب والا تسلیم۔

آپ نیازمند کے سوانحی حالات دریافت کرتے ہیں۔ حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ اول تو میں باضابطہ شاعر ہی نہیں ہوں۔ تخلص کا بھی گنہگار نہیں ہوں چکبست میرا عرف ہے نہ کہ تخلص۔ سولہ سترہ برس سے شعر و سخن کا مذاق ضرور ہے لیکن ایک دیوان بھی تیار نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں مجھے باضابطہ شاعروں کے زمرے میں داخل کرنا ہی بیکار ہے۔ مگر خیر مجموعہ میں تو میرا نام آہی گیا۔ اب آپ کو زندگی کے حالات کیا لکھوں لکھنؤ وطن ہے۔ عمر تقریباً ۲۸ سال ہے۔ اپنے دوستوں کا دل بہلانے کو کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ پرانے رنگ کی شاعری یعنی غزل گوئی سے ناآشنا ہوں لیکن اسی کے ساتھ میرا عقیدہ یہ ہے کہ محض نئے خیالات کو توڑ مروڑ کر نظم کردینا شاعری نہیں ہے میرے خیال کے مطابق خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے۔ لیکن میں پھر آپ کو لکھتا ہوں کہ میں قدردان سخن ہوں سخنور نہیں ہوں، جس کا نام شاعری ہے وہ اور چیز ہے جو بہرحال مجھے نصیب نہیں۔

"چکبست"

منشی پریم چند کا خط

دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور کے نام

بھائی جان! تسلیم۔ کل صبح ایک خط لکھا۔ شام کو آپ کا کارڈ ملا۔ پڑھکر نہایت صدمہ ہوا۔ بیماریاں اور پریشانیاں تو زندگی کا خلاصہ ہیں۔ لیکن بچے کی حسرت ناک موت ایک دل شکن حادثہ ہے اور اسے برداشت کرنے کا اگر کوئی طریقہ ہے تو یہی کہ دنیا کو ایک تماشا گاہ یا کھیل کا میدان سمجھ لیا جائے۔ کھیل کے میدان میں وہی شخص تعریف کا مستحق ہوتا ہے جو جیت سے پھولتا نہیں، ہار سے روتا نہیں۔ جیتے تب بھی کھیلتا ہے ہارے تب بھی کھیلتا ہے جیت کے بعد یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہاریں نہیں۔ ہار کے بعد جیت کی آرزو ہوتی ہے۔ ہم سب کے سب کھلاڑی ہیں مگر کھیلنا نہیں جانتے۔ ایک بازی جیتی۔ ایک گول جیتا تو ہپ ہپ ہرے کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔ ٹوپیاں آسمان میں اچھلنے لگیں۔ بھول گئے کہ یہ جیت دائمی فتح کی گارنٹی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری بازی ہار ہو۔ علی ہذا ہارے تو پست ہمتی پر کمر باندھ لی۔ روئے، کسی کو دھکے دیتے فاؤل کھیلا اور ایسے پست ہو گئے گویا پھر جیت کی صورت دیکھنی نہ نصیب ہوگی۔ ایسے اوچھے تنگ ظرف آدمی کو کھیل کے وسیع میدان میں کھڑے ہونے کا کوئی مجاز نہیں اس کے لئے گوشۂ تاریک ہے اور فکر شکم۔ بس یہی اسکی زندگی کی کائنات ہے۔ ہم کیوں خیال کریں کہ ہم سے تقدیر نے بے وفائی کی اخدا کا شکوہ کیوں کریں! کیوں اس خیال سے ملول ہوں کہ دنیا ہماری نعمتوں سے بھری تھالی کو ہمارے سامنے سے کھینچ لیتی ہے۔ کیوں اس فکر سے متوحش ہوں کہ قزاق ہمارے اوپر چھاپہ مارنے کی تاک میں ہے۔ زندگی کو اس نقطہ نگاہ سے دیکھنا اپنے اطمینان قلب سے ہاتھ دھونا ہے۔ بات دونوں

ایک ہی ہیں۔ قزاق نے چھاپا مارا تو گیا؟ بازی میں گھر کی ساری دولت کو کھو بیٹھے تو کیا؟ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جبر ہے دوسرا اختیار۔ قزاق زبردستی جان اور مال پر ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن ہار زبردستی نہیں آتی کھیل میں شریک ہو کر ہم خود ہار اور جیت کو بلاتے ہیں۔ قزاق کے ہاتھوں لوٹا جانا زندگی کا معمولی واقعہ نہیں، حادثہ ہے لیکن کھیل میں ہارنا اور جیتنا معمولی واقعے ہیں۔ جو کھیل میں شریک ہوتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ہار اور جیت دونوں ہی سامنے آئیں گی اس لئے اسے ہار سے مایوسی نہیں ہوتی۔ جیت سے پھولا نہیں سماتا۔ ہمارا کام تو صرف کھیلنا ہے خوب دل لگا کر کھیلنا خوب جی توڑ کر کھیلنا۔ اپنے کو ہار سے اس طرح بچانا گویا ہم کونین کی دولت کھو بیٹھیں گے لیکن ہارنے کے بعد پٹخنی کھانے کے بعد گرد جھاڑ کر کھڑے ہو جانا چاہیئے۔ اور پھر خم ٹھونک کر حریف سے کہے کہ ایک بار اور!

کھلاڑی بن کر آپ کو واقعی بڑا اطمینان ہو گا۔ میں خود نہیں کہہ سکتا کہ میں اس معیار پر پورا اتر دل گا یا نہیں مگر کم سے کم اب مجھے کسی نقصان پر اتنا رنج نہ ہو گا جتنا آج سے چند سال قبل ہو سکتا تھا۔ میں اب شاید نہ کہونگا کہ ہائے زندگی اکارت گئی۔ کچھ نہ کیا۔ زندگی کھیلنے کیلئے ملی تھی، کھیلنے میں کوتاہی نہیں کی۔ آپ مجھ سے زیادہ کھیلے ہیں۔ ہار اور جیت دونوں دیکھی ہیں۔ آپ جیسے کھلاڑی کیلئے شکوۂ تقدیر کی ضرورت نہیں۔ کوئی گولف اور پولو کھیلتا ہے، کوئی کبڈی کھیلتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ ہار اور جیت دونوں ہی میدانوں میں ہیں۔ کبڈی کھیلنے والوں کو جیت کی خوشی کچھ کم نہیں ہوتی۔ اس ہار کا غم نہ کیجئے۔ آپ نے خود ہی نہ کیا ہو گا۔ آپ مجھ سے مشاق ہیں۔ میں پانچ یا چھ مئی تک کانپور آنے والا ہوں۔ یہاں کی کوئی چیز درکار ہو تو بے تکلف لکھیئے گا۔ دیگر حالات میرے پہلے خط سے معلوم ہوں گے

آپکا دھنپت رائے (منشی پریم چند)

علامہ اقبالؒ کے خطوط

سید سلیمان ندوی کے نام

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے، حالات معلوم ہونے پر طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اطمینانِ قلب عطا فرمائے آپ کا یہ فقرہ کہ "میرے ساتھ خدا کا معاملہ عجیب ہے" گویا تمام امتِ مرحومہ کے احساسات کا ترجمان ہے۔ جو قوم ایک مشن لیکر پیدا ہوئی ہے اس کی روحانی تربیت کے لئے ابتلا کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ ایک انگریزی مصنف جسے ابتلا کے دور رس نتایج کا تجربہ ہو چکا تھا۔ لکھتا ہے کہ: "دکھ دیوتاؤں کی ایک رحمتِ عظیم ہے۔ تاکہ انسان زندگی کے ہر پہلو کا مشاہدہ کر سکے"۔ آپ امتِ محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس مامور من اللہ قوم کے خاص افراد کو ہی امرِ الٰہی ودلیعت کیا گیا ہے۔ فرقۂ یاسیہ کو چھوڑ کر فرقۂ رجائیہ میں آجائیے، جس حقیقت کو آپ زیر پردہ دیکھ چکے ہیں اس کی بے نقابی کا زمانہ قریب ہے۔ انشاء اللہ

"زمانہ باز بیفروخت آتشِ نمرود

کہ بے نقاب شود جوہرِ مسلمانی"

شخصی اعتبار سے مجھے آپ کے ساتھ حد درجہ ہمدردی ہے۔ یقین جانیے کہ آپ کے الفاظ نے میرے دل پر سوز وگداز کی کیفیت طاری کر دی اور میں دست بدعا ہوں کہ اللہ آپ کو آلام ومصائب میں استقامت عطا فرمائے۔

ہاں ترجمہ کی داد دیتا ہوں۔ لٹریری اغراض کے لئے یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے

میرے خیال میں اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکیں گے۔ البتہ فلسفیانہ اغراض کے لئے شاید اور الفاظ وضع کئے جائیں تو بہتر ہو گا۔

پنجاب میں بھی بیماری نے غضب ڈھایا، لاہور میں تو چند روز یہ حالت رہی کہ گورکن بھی نہ مل سکتے تھے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا

آپکا مخلص محمد اقبال

مولانا شوکت علی کے نام

بھائی شوکت! اقبال عزلت نشیں ہے اور اس طوفانِ بے تمیزی کے زمانہ میں گھر کی چار دیواری کو کشتیٔ نوح سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ہے مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو، میں ایک عرصے سے خدا گڑھ رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔ علی گڑھ والوں سے میرا اسلام کہیئے۔ مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے، اور اس قدر کہ ملاقاتِ ظاہری سے اُس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے

والسلام ۔ محمد اقبال

سر راس مسعود کے نام

چراغِ سحر ہوں۔ بجھا چاہتا ہوں۔ تمنّا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآنِ کریم کے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جدِ امجد حضور نبی کریم کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسّر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضور نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لا سکا۔ محمد اقبال

خواجہ حسن نظامی کا خط

اپنی بیٹی حور بالو کے نام

حور خانم! ذرا الینا اس خط کو جلدی سے پڑھ لو۔ پھر تم کو کھیل سے فرصت نہ ملے گی اور میں اپنے کام میں لگ جاؤں گا۔ بیٹی! اگر میں یہ سنوں کہ تم نے لکھنا ناغہ نہیں کیا تو جی کیسا باغ باغ ہو۔ مگر یہ امید کہاں ہے جب تک میں تقاضا نہ کروں تو تم کب خیال کرتی ہو۔ میری حور و! پڑھو تو اپنے شوق سے پڑھو، لکھو تو اپنے شوق سے لکھو۔ اب تم بارہ برس کی ہوئیں۔ وہ وقت قریب آیا کہ تم پرائے گھر کی ہو گی۔ کچھ لیاقت نہ ہوئی تو ناک کٹ جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ لکھنے پڑھنے والے باپ کی اکلوتی بیٹی اور قابلیت خاک نہیں۔ میرا کچھ بھی نہیں بگڑے گا جی تمہارا جلے گا۔ اس واسطے جہاں تک ہو سکے، ہر وقت سینے پرونے، کھانے پکانے، لکھنے پڑھنے میں دھیان رکھو۔ کھیل تماشے کا زمانہ ختم ہوا۔ اب اور وقت آرہا ہے۔

اری بنّو! ذرا سمجھ تو سہی۔ میں نے کہا۔ اس میں میری غرض کچھ نہیں ہے، جو ہے تیرے ہی فائدے کی بات ہے۔ سب کو آداب و سلام دعا پیار

بن باپ کا بچہ۔ حسن نظامی

مولانا ابو الکلام آزاد کے خطوط

مولانا حبیب الرحمن شیروانی کے نام

(۱)

قلعہ احمد نگر، ۱۴؍ جون ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم!

گزشتہ سال جب ہم یہاں لائے گئے تھے تو برسات کا موسم تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا اور جاڑے کی راتیں شروع ہو گئیں۔ پھر جاڑے نے بھی رختِ سفر باندھا، اور گرمی اپنا ساز و سامان پھیلانے لگی۔ اب پھر موسم کی گردش اُسی نقطہ پر پہنچ رہی ہے جہاں سے چلی تھی۔ گرمی رخصت ہو رہی ہے اور بادلوں کے قافلے ہر طرف سے اُمنڈنے لگے ہیں۔ دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہو چکیں، مگر اپنے دل کو دیکھتا ہوں تو ایک دوسرا ہی عالم دکھائی دیتا ہے۔ جیسے اس نگری میں کبھی موسم بدلتا ہی نہیں۔ سرمد کی رباعی کتنی پامال ہو چکی ہے پھر بھی بھلائی نہیں جا سکتی ؎

سرما بگزشت وایں دلِ زارہماں　　　گرما بگزشت وایں دلِ زارہماں

القصہ تمام سرد و گرم عالم　　　برما بگزشت وایں دلِ زارہماں

یہاں احاطہ کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے۔ کچھ دن ہوئے، ایک وارڈر نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی۔ اب بارش ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا۔ نیم کی شاخوں نے بھی زرد چیتھڑے اُتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا۔ جس ٹہنی کو دیکھو، ہرے ہرے پتوں اور سفید سفید پھولوں سے لد رہی ہے۔ لیکن اس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے

تو گویا اُس کے لیے کوئی انقلابِ حال ہوا ہی نہیں ویسی ہی سوکھی کی سوکھی پڑی ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے:

بہ ہمو ماہی غیر داغم پوشش دیگر نہ بود
تا کفن آمد ہمیں یک جامہ بر تن داشتم

یہ بھی اُسی درخت کی ایک شاخ ہے جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی، مگر اب اسے دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار و خزاں، گرمی و سردی، خشکی و طراوت سب اس کے لیے یکساں ہو گئے!

کل دوپہر کو اس طرف سے گزر رہا تھا کہ یکایک اس شاخ بریدہ سے پاؤں ٹھکرا گیا۔ میں رُک گیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ بے اختیار شاعر کی حسن تعلیل یاد آگئی ؎

قطع امید کردہ نخواہد نعیم دہر
شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

میں سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی امید و طلب کے بے شمار درخت اُگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ان کے لیے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ کوئی موسم بھی انہیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا! ؎

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

موسمی پھولوں کے جو درخت یہاں اکتوبر میں لگائے تھے، اُنھوں نے اپریل کے آخر تک

دن نکالے، مگر پھر انہیں جگہ خالی کرنی پڑی۔ مئی میں خیال ہوا کہ بارش کے موسم کی تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں چنانچہ نئے سرے سے تختوں کی درستگی ہوئی۔ نئے بیج منگوائے گئے۔ اور اب نئے پودے لگ رہے ہیں۔ چند دنوں میں نئے پھولوں سے نیا چمن آراستہ ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر میرے سامنے رہ رہ کر ایک دوسری ہی بات آ رہی ہے، سوچتا ہوں کہ دنیا کا باغ اپنی گل شگفتگیوں میں کتنا تنگ واقع ہوا ہے؟ جب تک ایک موسم کے پھول مرجھا نہیں جاتے، دوسرے موسم کے پھول کھلتے نہیں۔ گویا قدرت کو جتنا خزانہ لٹانا تھا، لٹا چکی، اب اسی میں ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک جگہ کا سامان اٹھایا دوسری جگہ سجا دیا، مگر نئی پونجی یہاں مل سکتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدسی کو پھولوں کا کھلنا پسند نہیں آیا تھا، اُسے اندیشہ ہوا تھا کہ اگر باغ کا پھول کھلے گا، تو اس کے دل کی کلی بند کی بند رہ جائے گی:

عیش ایں باغ باندازۂ یک تنگ دل ست

کاش گل غنچہ شود تا دل ما بکشاید!

غور کیجئے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ یہاں کا ہر بگاڑ در اصل ایک نئی بناوٹ ہوتی ہے:

بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی

میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں مگر اینٹوں کا پزاوہ بھر جاتا ہے۔ درختوں پہ آریاں چلنے لگتی ہیں۔ مگر جہاز بن کر تیار ہو جاتے ہیں۔ سونے کی کانیں خالی ہو گئیں لیکن ملک کا خزانہ دیکھیے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو رہا ہے۔ مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پا تک بہا دیا، مگر سرمایہ دار کی راحت وعیش کا سر و سامان درست ہو گیا۔ ہم مالن کی جھولی بھری دیکھ کر

خوش ہوتے لگتے ہیں، مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ کسی کے باغ کی کیاری اُجڑی ہوگی جبھی تو یہ جھولی معمور ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عرفیؔ نے اپنے دامن میں پھول دیکھے تھے تو بے اختیار چیخ اُٹھا تھا ؎

زمانہ گلشنِ عیش کرا بہ یغما داد؟ — کہ گل بہ دامنِ ما دستہ دستہ می آید

اکتوبر سے اپریل تک موسمی پھولوں کی کیاریاں ہماری دلچسپیوں کا مرکز رہیں صبح و شام کئی کئی گھنٹے ان کی رکھوالی میں صرف کر دیتے تھے۔ مگر موسم کا پلٹنا تھا کہ ان کی حالت نے بھی پلٹا کھایا، اور پھر وہ وقت آگیا کہ ان کی رکھوالی کرنا ایک طرف، کوئی اس کا بھی روادار نہ رہا کہ ان اجل رسیدوں کو چند دن اور ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے ایک ایک کر کے تمام کیاریاں اُکھاڑ ڈالی گئیں۔ وہی ہاتھ جو کبھی اونچے ہو ہو کر ان کے سر و سینہ پر پانی بہاتے تھے اب بے رحمی کے ساتھ ایک ایک ٹہنی توڑ مروڑ کر پھینک رہے تھے۔ جن درختوں کے پھولوں کا ایک ایک ورق حسن کا مرقع اور رعنائی کا پیکر تھا اب جھلسی ہوئی جھاڑیوں اور روندی ہوئی گھانس کی طرح میدان کے ایک کونے میں ڈھیر ہو رہا تھا اور صرف اسی مصرف کا رہ گیا تھا کہ جس سرد سامان کو جلانے کے لیے لکڑیاں میسر نہ آئیں، وہ انہی کو چولھے میں جھونک کر اپنی ہانڈی گرم کر لے ؎

گلگونہ عارض ہے، نہ ہے رنگِ حنا تو

اے خوں شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا!

زندگی اور وجود کے جس گوشہ کو دیکھیے قدرت کی کرشمہ سازیوں کے ایسے ہی تماشے نظر آئیں گے ؎

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش ست — زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش ست

انسانی زندگی کا بھی بعینہ یہی حال ہوا۔ سعی و عمل کا جو درخت پھل پھول لاتا ہے اس کی رکھوالی کی جاتی ہے اور جو بے کار ہو جاتا ہے، اُسے چھانٹ دیا جاتا ہے۔

ابوالکلام

(۲)

ہاؤس بوٹ سرینگر، ۲۴ اگست ۱۹۵۵ء

صدیق مکرم۔ زندگی کے بازار میں جنسِ مقاصد کی بہت سی جستجوئیں کی تھیں۔ لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔ معالجوں نے وادیٔ کشمیر کی گل گشتیوں میں سُراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا چنانچہ گزشتہ ماہ کے اواخر میں گُل مرگ پہنچا اور تین ہفتہ تک مقیم رہا۔ خیال تھا کہ یہاں کوئی سراغ پا سکوں گا، مگر ہر چند جستجو کی، متاعِ گم گشتہ کا کوئی سراغ نہیں ملا ع

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

آپ کو معلوم ہے کہ یہاں فیضی نے کبھی بارِ عیش کھولا تھا ے

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر

کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

لیکن میرے حصہ میں ناخوشی و علالت کا بار آیا۔ یہ بوجھ جس طرح کاندھوں پہ اُٹھائے آیا تھا اُسی طرح اٹھائے واپس جا رہا ہوں۔ خود زندگی بھی سرتاسر ایک بوجھ ہی ہے۔ خوشی سے اٹھائیں یا ناخوشی سے، مگر جب تک بوجھ سر پر پڑا

ہے اٹھانا ہی پڑتا ہے۔

گل مرگ سے سری نگر آ گیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں کل گل مرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا مکتوبِ منظوم حوالہ کیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس پیامِ محبت کو دلِ دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سُنا۔ میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے جو غالب نے کہا تھا ؎

باچوں توئی معاملہ بر خویش منت است
از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما!!

آپ نے اپنے تین شعروں کا پیغامِ دل نواز نہیں بھیجا ہے، لطف وعنایت کا ایک پورا دفتر کھول دیا ہے۔

ان سطور کو آئندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصور کیجئے۔ رہائی کے بعد جو کہانی سُنانی تھی وہ ابھی تک نوکِ قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

ابوالکلام

اردو نثری ادب

سید ابوالخیر کشفی
ظہیر الدین احمد

اردو مرکز لاہور